قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جولائی 1984

اس پرچہ میں

(۱) ظلم کا انجام کیا ہوتا ہے ؟

(۲) ہم عید کیوں مناتے ہیں ؟

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ ــــــــ لاہور

بدل اشتراک
سالانہ
پاکستان/۴۸ روپے
غیر ممالک/۹۸ روپے

ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰
خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ
۴
چار روپے

جلد ۳۷ — جولائی ۱۹۸۴ء — شمارہ ۷

فہرست

(۱) لمعات (اتحاد بین المسلمین) ـــــــــــ ۲
(۲) ظلم کا انجام۔ (پرویز صاحب) ـــــــــــ ۹
(۳) ہم عید کیوں مناتے ہیں (پرویز صاحب) ـــــــــــ ۳۳
(۴) اسلامی مملکت سے متعلق مزید سوالات ـــــــــــ ۵۲
(۵) درس قرآن مجید کے اعلانات ـــــــــــ ۶۳

ایڈیٹر محمد طفیل، ناشر شیخ عبدالحمید مقام اشاعت ۲۵-بی گلبرگ II لاہور، مطبوعہ اشرف پرنٹنگ پریس ۹، ایبک روڈ لاہور

باسمہ تعالےٰ

لمعات

اتحاد بین المسلمین

(کیا یہ ممکن ہے؟)

مسلمان ملکوں کی فضا میں "اتحاد بین المسلمین" یا "عالمگیر ملت اسلامیہ" جیسے الفاظ ایک عرصہ سے وجہ ارتعاش ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ اسکی بیش وجہ سید جمال الدین افغانی (مرحوم) کی سیاسی تگ و تاز اور علامہ اقبالؒ کی فکری کاوش سمجھئے جو عمر بھر اس قسم کی آوازیں بلند کرتے رہے کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر

اور

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا

حتیٰ کہ انہوں نے غیر مبہم الفاظ میں کہا کہ

> اسلام ایک عالمگیر سلطنت کا یقیناً منتظر ہے جو نسلی امتیازات سے بالاتر ہوگی اور جس میں شخصی اور مطلق العنانی بادشاہوں اور سرمایہ داروں کی گنجائش نہیں ہوگی۔ دنیا کا تجربہ خود ایسی سلطنت پیدا کرے گا۔ غیر مسلموں کی نگاہوں میں شاید یہ محض خواب ہو لیکن مسلمانوں کا یہ ایمان ہے۔ (گفتارِ اقبالؒ ص۱۶۸)

اب کچھ عرصہ ادھر سے مسلم ممالک کو جو ان کی حریف قوتوں سے خطرات لاحق ہوئے ہیں تو اس اتحاد (بین المسلمین) کی آوازیں تیز تر ہو گئی ہیں اور عملی اقدامات کے سلسلہ میں بین الملی کانفرنسوں، سیمیناروں، مذاکروں کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اتحاد کا کوئی نشان دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اتحاد کی ان کوششوں کا جذبۂ محرکہ تحفظ خویش (PRESERVATION OF SELF) کا فطری تقاضا ہے اور اسکی شکل یہ ہے کہ جن ممالک کو کسی ایک سپر پاور کیطرف سے خطرہ لاحق ہوتا ہے، وہ ایک گروپ بن کر اپنی حفاظت کی تدابیر سوچتے ہیں اور دوسری سپر پاور انہیں اپنے زیر سایۂ عاطفت لے لیتی ہے، دوسرے مسلم ممالک اس پاور کے مد مقابل دوسری پاور کی چھتری کے نیچے آ جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر تحفظ خویش کی کوشش میں بھی مسلم ممالک سپر پاورز کے زیر سایہ دو گروہوں میں بٹ کر ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان

کوششوں کا نام رکھا جاتا ہے۔ اتحاد بین المسلمین، جو ظاہر ہے کہ ناکام رہتی ہیں۔

ایسا کیوں ہے؟ یہ سوال تو بڑی گہری تحقیق کا متقاضی ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ مسلمان اقوام، بہ حیثیتِ مجموعی، بڑی جذباتی واقع ہوئی ہیں اور سوچ بچار سے بہت کم کام لیتی ہیں۔ اور اگر وہ جذباتی نہیں ہوتیں تو (بصد معذرت کہنا پڑتا ہے کہ) ان کی بیشتر مساعی محض جماعتی ہوتی ہیں۔ اگر وہ سوچ بچار سے کام لیں تو اتحاد بین المسلمین کا مسئلہ ایسا نہیں جس کی ناکامی کے اسباب سمجھ میں نہ آسکیں۔

بادنیٰ تدبّر یہ حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے کہ اتحاد کے لئے کسی قدرِ مشترک کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ دو افراد میں باہمی اتحاد پیدا نہیں کر سکتے۔ اگر ان میں کوئی ایسی مشترک قدر نہ ہو جو انہیں ایک نقطہ پر جمع کر کے ان میں یگانگت پیدا کر سکے۔ جو کیفیت دو افراد کی ہے، وہی اجتماعی طور پر، اقوام کی ہے۔ اس وقت دنیا کے مسلمان چالیس پینتالیس آزاد خود مختار قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ان کی قومیّت کی بنا نسل کا اشتراک ہے یا زیادہ تر وطن (جغرافیائی حدود) کا اشتراک۔ اس آئیڈیل سے تو سرِدست قطع نظر کیجئے کہ آپ ان کے ان تمام جداگانہ تشخصات کو مٹا کر، انہیں ایک عالمگیر برادری بنا دینا چاہتے ہیں۔ سرِدست اس ابتدائی مقصد کو لیجئے کہ آپ ان کے جداگانہ تشخصات باقی رکھتے ہوئے ان میں اتحاد پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ قدرِ مشترک کیا ہے جو ان میں اس اتحاد کی بنیاد بن سکتی ہے۔ اس اہم ترین سوال کے جواب میں آپ بلا تکلّف اور بلا تامّل کہہ دیتے ہیں کہ ان میں قدرِ مشترک اسلام ہے۔ لیکن یہ کہتے وقت آپ نے کبھی سوچا ہے کہ وہ اسلام ہے کہاں جو ان میں قدرِ مشترک ہے؟ جذبات سے الگ ہٹ کر ذرا اس سوال پر عقل و فکر کی رُو سے غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ اس کے کیا نتائج آپ کے سامنے آتے ہیں۔ اسلام کو من حیث الکل چھوڑ کر، اس کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو لیجئے۔ مثلاً سب سے پہلے نماز کو لیجئے جسے ان میں بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور یوں نظر آتا ہے گویا یہ ساری دنیا کے مسلمانوں میں قدرِ مشترک ہے۔ لیکن، ایک ملک کو چھوڑ دیجئے، ایک شہر کو بھی چھوڑ دیجئے۔ ایک محلہ کو لیجئے۔ محلہ کے لوگ اکٹھے بس رس رہے ہوں گے۔ ان میں کوئی باہمی اختلاف نظر نہیں آئے گا لیکن نماز کی اذان ہو تو آپ دیکھیں گے کہ وہی مسلمان الگ الگ گروہوں میں بٹ جائیں گے۔ مختلف مسجدوں میں چلے جائیں گے اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر نماز نہیں پڑھیں گے۔ ان کے اس افتراق اور اختلاف کی شدّت کا کیا عالم ہے، اس کے متعلق آپ آئے دن اس قسم کی خبریں اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں۔

(ریڈنگ۔ برطانیہ) پولیس نے یہاں ایک مسجد کا انتظام چلانے کے لئے تنازعہ پر مسلمانوں کے دو متحارب گروہوں میں ہونے والے تشدد آمیز واقعات کی تفتیش

شروع کر دی ہے۔ پولیس کے مطابق جنوبی انگلستان کے اس شہر میں واقع مسجد میں گذشتہ اتوار کو ستر نمازیوں پر ہاکیوں اور چاقوؤں سے مسلح (۳۵) افراد نے حملہ کر دیا۔ جس سے ایک فرد شدید زخمی ہو گیا۔ پولیس نے اس واقعہ کے سلسلہ میں متعدد افراد کو گرفتار کر لیا۔ ایک ہفتہ قبل یہاں نماز کے دوران وہابی فرقے کے دو افراد پر حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا گیا۔ اس سلسلہ میں (۶) افراد گرفتار ہوئے۔ (جنگ لاہور مورخہ ۳۰ مئی ۱۹۸۴ء)

یا مثلاً:

(گکھڑ منڈی) گذشتہ رات یہاں تقریباً ساڑھے نو بجے اسلام آباد میں مقیم ایک اسلامی ملک کے سفارت کار کو اس وقت شدید مشکل کا سامنا کرنا پڑا جب اس نے لاہور سے اسلام آباد جاتے ہوئے نماز عشا کی ادائیگی کے لئے اپنی گاڑی جی ٹی روڈ گکھڑ پر ایک مرکزی جامع مسجد کے سامنے کھڑی کی چنانچہ ان کی اس وقت حیرت کی انتہا نہ رہی جب مسجد کے گیٹ پر انہوں نے ایک بہت بڑا تالا لگا ہوا دیکھا، وہ قریب ہی ایک اور جامع مسجد کیطرف گئے، لیکن وہاں بھی تالا دیکھ کر انہیں مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس موقع پر ایک شہری کے استفسار پر سفارت کار نے اس امر پر شدید حیرانگی کا اظہار کیا کہ پاکستان کی مسجدوں میں تالے کیوں لگائے جاتے ہیں۔ تاہم بعد ازاں، اس سفارت کار نے جامع مسجد کے سامنے پڑے ہوئے ایک لکڑی کے پھٹے پر نماز عشا ادا کی اور اسلام آباد روانہ ہو گئے۔

(جنگ لاہور۔ ۲۹ مئی ۱۹۸۴ء)

اور یہ تو آپ کو یاد ہی ہوگا کہ تحریکِ نظامِ مصطفیٰؐ کے دوران، رمضان المبارک کی ایک شام، افطاری کے بعد، چودھری ظہور الٰہی (مرحوم) کی کوٹھی کے لان میں، فقہ حنفی کے دو مقتدر علماء، مفتی محمود (مرحوم)، اور مولانا نورانی نے الگ الگ نمازیں پڑھی تھیں اور نورانی صاحب نے صدرِ مملکت سے بڑے فخر کے ساتھ کہا تھا کہ "ہم تو امامِ حرم کے پیچھے بھی نماز نہیں پڑھتے"۔ فقہ حنفی کے انہی دو فرقوں (دیوبندی اور بریلوی) نے "یا رسول اللہؐ" اور "رسول اللہؐ" کے نعروں کے اختلاف پر (حال ہی میں) بادشاہی مسجد لاہور میں جس فساد آمادہ اجتماعات کے مظاہرے کئے تھے، وہ کسے یاد نہیں۔

یہ ہے اس "اسلام" کی وہ عمومی قدرِ مشترک جسے آپ عالمگیر اتحاد بین المسلمین کی بنیاد بنانے کے مدعی ہیں۔ آپ اپنے محلہ کے دو گروہوں کو ایک صف میں کھڑا کر کے نماز پڑھانے کی کوشش کریں، پھر دیکھیں کہ اتحاد بین المسلمین کا خواب کسطرح پریشان ہوتا ہے!

یہ چھوٹے سے چھوٹے پیمانے کی بات ہے۔ بڑے پیمانے کی طرف آیئے تو ایران اور عراق میں برسوں سے جنگ جاری ہے اور دنیا بھر کے مسلمانوں نے ان میں مصالحت کی کوششیں کر دیکھی ہیں۔ "اسلام" ان سب میں قدرِ مشترک ہے۔ پھر اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ دونوں ملک بڑے طمطراق سے اعلان کرتے رہتے ہیں کہ ہم نے فریقِ مخالف کے اتنے ہزار افراد ہلاک کر دیئے حالانکہ (جس اسلام کے یہ دونوں دعویدار ہیں، اس کا واضح اعلان ہے کہ) وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا (۴/۹۳) جس نے کسی ایک مسلمان کو بھی عمداً قتل کر دیا، اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جس میں وہ رہے گا۔ اس پر خدا کا غضب ہوگا اور لعنت۔ خدا نے اس کے لئے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ ہمارے ہمسایہ ملک افغانستان میں آدھے مسلمان ایک طرف ہیں اور آدھے دوسری طرف۔ اور دونوں برسوں سے مصروفِ نبرد آزمائی ہیں! وہاں "اسلام" کی قدرِ مشترک نے کیا نتیجہ مرتب کیا ہے؟ لبنان میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ خلیج میں حالات جو رُخ اختیار کر رہے ہیں (خدا محفوظ رکھے)، وہاں اگر شعلہ بھڑکا تو مسلمانوں کی مملکتیں جسطرح غلطیدہ خاک و خون ہوں گی، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ "اسلام" کی قدرِ مشترک ان کے کسی کام نہیں آسکے گی۔

یہ ہے اس قدرِ مشترک کی حقیقت جسے ہم عالمگیر اتحادِ ملی کی بنیاد پر تصور کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت اسلام، دنیا میں کہیں ہے ہی نہیں۔ دنیا کے مسلمان اسی طرح مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں، جسطرح دیگر اقوامِ عالم۔ اور باہمی مخالفت، رقابت، عداوت اور قتل و غارت گری کے جس جہنم میں وہ قومیں گرفتار ہیں، اسی میں مسلم اقوام مبتلا ہیں۔ مسلم اقوام کی حالت بلکہ ان سے بھی ابتر ہے کہ ان کے ہاں (سیاسی پارٹیوں کے علاوہ) مذہبی فرقہ بندی نے جہنم کے اندر ایک اور جہنم پیدا کر رکھا ہے۔ یعنی مسلمانوں کے ہاں، وطنی قومیت کے اندر بھی انتشار اور اختلاف باقی رہتا ہے اور اس کی وجہ ہوتی ہے وہ "اسلام" جسے ہم عالمگیر وحدت کی بنیاد بنانا چاہتے ہیں۔

ہم بڑے فخر سے اعلان کرتے ہیں کہ اسلام نے ایک ایسی امت کی تشکیل کی تھی جو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح محکم و استوار تھی۔ اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔ افتراق نہیں تھا۔ اور اس کے بعد ہم (دنیا کو تو نہیں، اپنے آپ کو) اس خود فریبی میں مبتلا کر لیتے ہیں کہ موجودہ اسلام کی رُو سے ہم ملتِ واحدہ بن سکتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ اسلام میں آج بھی اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ ایک امتِ واحدہ کی تشکیل کر سکے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ اسلام آج ہے کہاں؟ آپ کو معلوم ہے کہ

جس اسلام نے اس امتِ واحدہ کی تشکیل کی تھی، جو شخص اسے اختیار کرنا چاہتا تھا اسے کیا کچھ چھوڑنا پڑتا تھا؟

۱۔ ہر قسم کی قبائلی نسبت۔ یعنی ذات پات، گوت برادری کے تمام علائق۔
۲۔ ہر طرح کا نسبی تفاخر اور رنگ، نسل، زبان تک کے امتیازات۔
۳۔ وطن اور سابقہ قومیت کی نسبت۔
۴۔ سابقہ مذہب کے تمام عقائد، نظریات و تصورات وغیرہ

یہ اسلام میں داخل ہونے، یعنی اس امت کا فرد بننے کے لئے حصہ لاَ تھا۔ یہ سب کچھ چھوڑ کر وہ اس امت کا فرد بنتا تھا جس میں صرف اسلام کی نسبت باقی رہتی تھی۔ اسی کا نام توحید تھا۔ اسی کو صبغۃُ اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی اللہ کا رنگ۔ اس تشبیہ میں بڑی گہری معنویت پوشیدہ ہے۔ جب آپ کسی کپڑے کو نئے رنگ میں ڈبوتے ہیں تو اس پر سابقہ رنگوں میں سے کسی رنگ کی جھلک تک باقی نہیں رہتی۔ اگر اس میں کسی سابقہ رنگ کی خفیف سی جھلک بھی نظر آ جائے تو کہا جائے گا کہ اس پر نیا رنگ ٹھیک طرح چڑھا نہیں۔

کیا آپ مسلمانوں کی ایسی قوم کی نشاندہی کر سکتے ہیں جس نے تمام سابقہ خیالات۔ نظریات اعتقادات کو چھوڑ کر اور تمام نسبتوں اور اضافتوں کو ترک کر کے صرف اعتصام بحبل اللہ (خدا کی کتاب کے ساتھ تمسک) کو اپنا شعار قرار دے رکھا ہو۔ اور صرف اسلام کو وجہِ تشخص بنا لیا ہو۔

یہ تھا وہ اسلام جس نے رنگ، نسل، ذات برادری۔ وطن۔ سابقہ اعتقادات و نظریات کی تفریق و تخصیص کو مٹا کر قرآن کی بنیادوں پر ایک نئی امت کی تشکیل کی تھی۔ یہی وہ قدرِ مشترک تھی جو ان کے باہمی (اتحاد تو بڑا پیش پا افتادہ تصور ہے) ائتلافِ قلبی کی بنیاد بنی تھی۔ وہ اسلام اب دنیا میں کہیں بھی موجود نہیں۔ لہٰذا ہمارا یہ کہنا کہ ہم موجودہ "نام کے اسلام" کی بنیادوں پر ملی اتحاد پیدا کر لیں گے، خود فریبی نہیں تو حقیقت سے بے خبری کی دلیل ضرور ہے۔ اس وقت مسلمانوں میں قدرِ مشترک صرف ان کے نام ہیں۔ اور نام کی تو آپ جانتے ہیں ذاتی حیثیت کچھ بھی نہیں ہوتی۔ دنیا بھر کے مسلمان قومیتوں میں بٹے ہوئے ہیں اور اب خود مغرب کی اقوام اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہو رہی ہیں کہ جب تک قوموں کا تشخص اور وجود باقی ہے، عالمگیر انسانیت وجود میں نہیں آ سکتی۔ قومیتوں میں باہمی بغض و عداوت بُعد و رقابت کس حد تک ہوتی ہے، اس کا اندازہ ایک حقیقت سے لگائیے۔ ہندوستان کے تمام مسلمان تقسیم سے پہلے تک ایک تھے۔ تقسیم کے بعد کچھ اِدھر آ گئے، کچھ اُدھر رہ گئے۔ اس سے ان میں کس قدر گہری خلیج حائل ہو گئی، اس کے متعلق کسی عامی نے نہیں، دارالعلوم دیوبند کے

شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جمیعت العلماءِ ہند کے اجلاس (منعقدہ اپریل ۱۹۴۸ء) میں اپنے خطبۂ صدارت کے دوران فرمایا تھا کہ

> تقسیم ہند کے ساتھ ہی مسلمانانِ ہند اور مسلمانانِ پاکستان کے مفاد بھی تقسیم ہو گئے ہیں۔ ہمارا فریضہ اب یہی ہے کہ ہم مسلمانانِ ہند کے مفاد کا تحفظ کریں نہ کہ ان مسلمانوں کے مفاد کا جو سرحدِ ہند کے اُس پار پاکستان میں بستے ہیں۔ اگر کبھی ہندوستان اور پاکستان میں شدید قسم کے اختلافات رُونما ہو گئے تو ہمارا مسلک ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کی روشنی میں متعین ہو گا نہ کہ پاکستان کے مفاد کے پیشِ نظر۔ وہ اپنے مفاد کی حفاظت آپ کر سکتے ہیں۔
>
> (ہندوستان ٹائمز مورخہ ۲۸ اپریل ۱۹۴۸ء۔ بحوالۂ طلوعِ اسلام جون ۱۹۴۹ء ص ۱۷)

آپ سوچئے کہ مروجہ "اسلام" پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں میں وہی تھا جو تقسیم سے پہلے تھا۔ تقسیم ہند کے بعد کس بات نے ان دونوں میں اس قدر بُعد اور مغائرت، بلکہ عداوت پیدا کر دی؟ یہ اختلافِ قومیت کا ہے۔ یہی اختلافِ قومیت دنیا کے تمام مسلمانوں میں موجود ہے۔ اس کی موجودگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ ان میں باہمی اتحاد پیدا ہو سکے؟ ان میں آپ سیاسی مفادات اور مصالح کے اشتراک کی بناء پہ معاہدات کر سکتے ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح غیر مسلم اقوام کے ساتھ معاہدات کئے جاتے ہیں۔ یہ معاہدات نہ تو دائمی ہوں گے، نہ ہی ان میں "اسلام" کا کوئی عمل دخل ہو گا۔

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہے کہ

(۱) جو "اسلام" اتحاد بین المسلمین ہی نہیں بلکہ وحدتِ اُمت کی بنیاد بن سکتا تھا، وہ اس وقت مسلمانوں کے کسی ملک میں بھی موجود نہیں۔ اور

(۲) ہمارا مروجہ اسلام دو نمازیوں میں اتحاد پیدا نہیں کر سکتا چہ جائیکہ وہ دنیا کی مسلمان قوموں میں اتحاد کی بنیاد بن سکے۔

جب تک ہم ان حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں کرتے، ہم اپنی جذباتی خوش فہمیوں کے سرابوں سے نکل نہیں سکتے۔ اور جب تک ہم ان سرابوں سے نہیں نکلتے، ہماری کوئی کوشش محسوس نتیجہ مرتب نہیں کر سکتی۔ قرآن مجید نے بہت پہلے کہہ دیا تھا: لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتٰبِ ط۔ (۴/۱۲۳) سراب آسا خوش فہمیوں اور فریب انگیز آرزوؤں سے کوئی مثبت نتیجہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ مثبت نتائج حقائق کا سامنا کرنے سے ہی برآمد ہو سکتے ہیں۔ ہماری مصیبت یہ ہے کہ اسلام ہمارے ہاں ہے نہیں، لیکن ہم اس لفظ کو اُٹھتے بیٹھتے دہراتے رہتے ہیں۔ سیکولرازم پہ ہمارا عمل ہے، لیکن اس کا ہم کھلے بندوں اعتراف نہیں کرتے۔ ہماری حالت لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ ط (۴/۱۴۳) کی سی ہے۔ نہ ادھر

نہ ادھر کے، نہ یقین اس پر، نہ یقین اس پر۔ لیکن حقیقتِ کائنات یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ پختہ عقائد کی بنا پر مرتب ہوتے ہیں۔ اقبالؒ کے الفاظ ہیں:۔

حکمتِ مشرق و مغرب نے سکھایا مجھ کو — ایک نکتہ کہ غلاموں کے لئے ہے اکسیر
دین ہو، فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو — ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں — ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

ایمان تو بہت بڑی چیز ہے۔ پختہ عقیدہ کفر پر ہو تو وہ بھی اپنا نتیجہ پیدا کر دیتا ہے۔

* * *

قرآن کے اس آئینہ میں آپ اپنے خط و خال دیکھ کر یقیناً مایوس ہو جائیں گے۔ لیکن قرآن تو مایوسی کو کفر قرار دیتا ہے۔ مایوس وہ ہوتا ہے جس کے سامنے کوئی راستہ نہ رہے، اور قرآن ہر حالت (SITUATION) میں انسان کی راہنمائی کرتا ہے۔ اس نے ہماری مایوسی کا بھی علاج بتایا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم اسی علاج کو اختیار تو ایکطرف تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں گے۔ سنیئے وہ علاج کیا بتاتا ہے: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا۔ "اے وہ! جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہو" غور کیجئے، یہاں خطاب "ایمان والوں" سے کیا گیا ہے، اور ان سے کہا گیا ہے۔ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ (۴/۱۳۶)۔ "تم ایمان لاؤ اللہ پر، اس کے رسولؐ پر اور اس کتاب پر جو اس رسولؐ پر نازل کی گئی تھی"۔ آپ نے کچھ سمجھا کہ بات کیا ہوئی؟ وہ ہمارے دعوائے ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا، وہ ہم سے بھی ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔

وہ موجودہ مسلمانوں میں سے اس امت کی تشکیل کرنا چاہتا ہے جو قرآن پر ایمان لا کر امتِ مسلمہ ہونے کا دعویٰ کرے۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ قوم یہ فیصلہ کرے (اور اس فیصلہ پر عمل کرے) کہ اس کے تمام معاملات قرآن کے مطابق طے پائیں گے۔

یہ ہوگی وہ امت جس کے افراد ایک دوسرے کے بھائی ہوں گے (فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ۳) اور ان کے دل ایک دوسرے سے جڑے ہوئے (وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ ۳/۱۰۳)۔ یہ امت تمام خارجی نسبتوں (رنگ، نسل، زبان، نسب، وطن، حتیٰ کہ شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد، حنفی، شافعی وغیرہ نسبتوں) سے پاک ہوگی، اور اپنے آپ کو صرف مسلم کے تشخص سے متعارف کرائے گی۔ (هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ ۲۲/۷۸)۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو مسلمانوں کی موجودہ مملکتوں میں (دوسری قوموں کی طرح) سیاسی معاہدات ہو سکیں گے، اتحادِ ملی نہیں ہو سکے گا۔

* * *

باسمہٖ تعالیٰ

ظلم کا انجام

پرویز

شائع کردہ

ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ ۔ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

ظلم کا انجام

> "اُن کی تباہی پر نہ آسمان رویا، نہ زمین
> کی آنکھ نم آلود ہوئی" ۴۴/۲۹ (القرآن العظیم)

(پرویز)

دو ذہنیتوں کا فرق قابلِ غور ہے۔

ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں ایسا انتظام کر لوں کہ قانون کی گرفت میں نہ آ سکوں، یا اگر اس کی گرفت میں آ بھی جاؤں تو، اپنے اثر و رسوخ، سفارش رشوت کے ذریعے مواخذہ سے بچ جاؤں تو پھر مجھے کسی کی پرواہ نہیں، میں جس پر چاہوں، ظلم و زیادتی کر دوں، جن طریقوں سے چاہوں اپنے مفاد حاصل کر دوں، جس قانون کی جی چاہے، خلاف ورزی کر دوں، جس قسم کی چاہوں دھاندلی مچاؤں۔ میں اپنے ہر مقصد میں کامیاب رہوں گا اور مجھے کسی قسم کا خوف و خطر نہیں ہوگا۔ اسی طرح ایک قوم سوچتی ہے کہ اگر میں اپنے ہاں کافی قوت جمع کر لوں، تو پھر جس قوم کا جی چاہے گلا دبا دوں، جسے چاہوں اپنا غلام بنا لوں، جس پر چاہوں ظلم و استبداد کر دوں، ہر طرح کی کامیابیاں اور کامرانیاں میرے حصے میں آئیں گی۔ مجھے کسی سے کوئی ڈر اور خوف نہیں ہوگا۔

لیکن ایک دوسرا شخص (یا قوم) ہے جسے ہر طرح کی قوت حاصل ہے۔ اس کا اثر و رسوخ بھی کافی ہے، دولت اور ذرائع کی بھی کمی نہیں، اسے دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنے کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ اسے جائز و ناجائز طریق سے مال و دولت حاصل کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ لوٹ کھسوٹ اور سلب و نہب کی کوئی بازپرس نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو اس کا ہاتھ روک سکے یا گلا دبا سکے۔ اس کے گرد و پیش افراد (یا اقوام) دن دہاڑے ناانصافیاں کرتے اور (بظاہر) پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے سامنے زندگی کا ایک محکم نظریہ، ایک اٹل قانونِ حیات، ایک غیر متبدل کلیہ ہے جس کی صداقت پر اُسے یقینِ کامل ہے۔ یعنی یہ کہ

إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ (۶/۲۱)

یاد رکھو! ظلم کرنے والا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ظالم کی کھیتی پروان نہیں چڑھ سکتی، وہ کبھی پنپ نہیں سکتا۔

اس نظریۂ زندگی، اس قانونِ حیات، اس محکم کلیہ پر اس کا ایمان، ظلم و جور کے ہر قسم کے ذرائع، اور مواقع کے باوجود، اسے کبھی ظلم و جور پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ لوگ اس سے کہتے ہیں کہ تم کس فریب میں مبتلا ہو، دیکھتے نہیں کہ لوٹ کھسوٹ کرنے والے کس طرح دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرتے چلے جاتے ہیں، ایسے مواقع روز روز نہیں آتے۔ لیکن وہ اس ترغیب و تحریص کے باوجود، کامیابی کے لئے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرتا۔ اور اپنے ناصحِ مشفق سے سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ جسے تم ان کی ترقی سمجھ رہے ہو، یہ سب "جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری" ہے — حقیقت یہی ہے کہ:۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِينَ ظَلَمُوا! — (۶/۴۵)

ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

زندگی کا یہ قانون اٹل ہے کہ هَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الظَّالِمُونَ — (۶/۴۷) ظالم قوم کی تباہی یقینی ہے۔ وہ زندگی کی شادابیوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے۔ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظَّالِمِينَ۔ (۷/۴۴)

اوّل الذکر ذہنیت کا نام ہے —— خدا کا انکار —— اسے کفر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی خدا کے ابدی قوانین کی صداقت سے انکار —— اور ثانی الذکر ذہنیت کو خدا پر ایمان کہتے ہیں اور اس قسم کا ایمان رکھنے والوں کو قرآن کی زبان میں مومن اور مسلم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

آئیے! ہم دیکھیں کہ ہمارا شمار کس گروہ میں ہوتا ہے۔

ظلم کسے کہتے ہیں؟

اس مقصد کے لئے سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ظُلم کسے کہتے ہیں؟ اس کے معانی کیا ہیں اور مفہوم کیا؟

لفظ ظلم کے بنیادی معنی "کمی کرنے" کے ہیں۔ یعنی کسی کے حقوق و واجبات میں کمی کرنا۔ اسے وہ کچھ، اور اتنا نہ دینا جس کا وہ حقدار ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں ہر قسم کی ناانصافی، جور، استبداد، قانون کی خلاف ورزی، اور سرکشی آ جاتی ہے۔ لیکن امام راغبؒ نے اس (لفظ) کی ایک ایسی تعریف (DEFINITION) دی ہے جو اس کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ یعنی ظلم سے مراد ہے:۔

کسی شئے کا اس مقام پر نہ ہونا جس مقام پر اُسے ہونا چاہیئے۔

اسی سے لفظ "ظلمت" آتا ہے۔ جس کے معنی ہیں —— جس مقام پر روشنی ہونی چاہیئے تھی وہاں روشنی کے بجائے تاریکی ہونا۔

یہ تو ہوئے اس کے لغوی معنی۔ لیکن قرآن کریم، اس کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کو اس صراحت اور وضاحت سے سامنے لایا ہے کہ ان کی روشنی میں، اس جامع حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دشواری ہی نہیں رہتی کہ ظلم کسے کہتے ہیں اور ظالم کون ہوتا ہے۔

شرک سب سے بڑا ظلم ہے

سب سے پہلے وہ، ظلم کے ایک ایسے گوشے کو سامنے لاتا ہے جس کی طرف کسی کی نگاہ ہی نہیں اُٹھ سکتی تھی۔ آپ نے کبھی کسی کو یہ کہتے نہیں سنا ہو گا کہ شرک ظلم ہے۔ اور مشرک، ظالم ہوتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم کا اعلان ہے کہ شرک، ظلم ہی نہیں بلکہ "ظلمِ عظیم" ہے (۳۱/۱۳) یہ نکتہ غور سے سمجھنے کے قابل ہے۔

قرآنِ کریم کی رُو سے توحید (یعنے ایک خدا کو ماننے) سے مراد یہ ہے کہ انسان، صرف قوانین و احکام خداوندی کی اطاعت کرے۔ اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہ کرے۔ اگر اس نے، خدا کے (سوا یا اس کے) علاوہ کسی اور کے احکام و قوانین کی اطاعت کی، تو اس نے گویا، اس شخص (یا قوت) کو اس اقتدار و اختیار میں شریک کر لیا جو صرف خدا کے لئے مختص تھا۔ اس سے یہ شخص (یا قوت) اس مقام پہ نہ رہے جس مقام پہ انہیں رہنا چاہیئے تھا۔ اس سے بڑا شرک اور کیا ہو گا؟

دوسری طرف اس انسان کو لیجیئے جو شرک کا مرتکب ہوتا ہے۔ خدا نے انسان کو کائنات میں سب سے بلند مقام عطا فرمایا ہے۔ اس لئے کہا ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) "جو کچھ زمین و آسمان میں ہے، خدا نے اس سب کو تمہارے لئے تابع تسخیر کر دیا ہے۔" یہ تو رہا خارجی کائنات کے متعلق۔ باقی رہے دوسرے انسان تو اس نے کہا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے تمام انسانوں کو یکساں طور پر واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ اب اگر ایک انسان، خارجی کائنات کی کسی قوت کے سامنے جھکتا ہے تو وہ اپنے سے ادنیٰ شئے کو، اپنے سے زیادہ عظمت کا مستحق قرار دیتا ہے اور اگر کسی انسان کے احکام کے سامنے جھکتا ہے تو یہ اپنے جیسے انسان کو اپنا حاکم قرار دیتا ہے۔ اس کا یہ عمل، دونوں صورتوں میں، شرفِ انسانیت کی تذلیل کا موجب ہے۔ اس سے اس نے اپنے آپ کو اس مقام پر نہیں رکھا جس مقام پر انسان ہونے کی حیثیت سے اُسے ہونا چاہیئے، اور یہ بہت بڑا ظلم ہے۔

شرک کی پہلی صورت اگر خدا کے خلاف شرک تھا تو دوسری صورت، خود انسان کی اپنی ذات کے خلاف شرک ہے۔ اور یہ "ظلم عظیم" ہے۔

شرک (ظلم عظیم) کی اس شکل کو سامنے رکھیئے اور پھر دیکھئے کہ ہم میں سے کتنے ہیں جو اس جرم کے

مرتکب نہیں ہو رہے ــــــ زندہ انسان تو ایک طرف، ہماری ذلّت کی انتہا ہے کہ ہم مردہ انسانوں تک کے حضور جھکتے اور گڑگڑاتے ہیں اور ہر سانس میں غیر خداوندی احکام و قوانین کی اطاعت کرتے ہیں۔ یاد رکھیئے! خدا کی عبادت کے معنی خدا کی اطاعت ہیں۔ یعنی اس کے احکام و قوانین کی اطاعت کرنا۔ لہٰذا، انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی محکومیت یا اطاعت اختیار کرنا ظلمِ عظیم ہے۔

ــــــ (۰) ــــــ

یہاں تک تو شرک (یعنی ظلمِ عظیم) کی اس نوع کا ذکر تھا جس میں انسان کسی دوسرے کی محکومیت اختیار کرتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم اس باب میں، ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر خدا کے احکام و قوانین کے خلاف، تم اپنے جذبات و خواہشات کے پیچھے چلنے لگ جاؤ تو یہ بھی شرک ہے۔ تمہارے جذبات کا صحیح مقام یہ ہے کہ ان سے، قوانینِ خداوندی کی روشنی میں کام لیا جائے، نہ یہ کہ انہیں اپنے آپ پر مسلّط کر لیا جائے۔ یہ بھی ظلم ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے:۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۔ (۳۰/۲۹)

یہ ظالم، وحی کی روشنی کے بغیر، اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔

بظاہر یہ بات سمجھ میں نہیں آئے گی کہ اتباعِ جذبات کو ظلم سے کیوں تعبیر کیا گیا ہے لیکن بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سامنے آ جائے گی کہ ظلم و تعدی کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ انسان قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر، اپنی من مانی کرنے لگ جائے۔ اسی کو "اتباعِ جذبات بغیر علم" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ جو شخص اپنے جذبات و خواہشات کو وحی کے تابع رکھے اور یوں تمام معاملات کے فیصلے، قوانینِ خداوندی کے مطابق کرے، اس سے ظلم سرزد ہو ہی نہیں سکتا۔

ظالم حکومت

یہی چیز جب انفرادی زندگی سے آگے بڑھ کر، انسانوں کی اجتماعی زندگی سے متعلق ہو جائے، تو اس وقت یوں کہا جائے گا کہ عدل و انصاف پر مبنی حکومت وہی کہلا سکتی ہے جس میں تمام امور کے فیصلے قوانینِ خداوندی کے مطابق ہوں۔ جو نظامِ مملکت، قوانینِ خداوندی کے مطابق قائم نہ ہو، قرآنِ کریم اسے ظالم کہہ کر پکارتا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے:۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ (۵/۴۵)

جو حکومت، وحی خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتی، تو یہی لوگ ہیں جنہیں ظالم کہا جاتا ہے۔

ظالم بھی، اور کافر بھی۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۔ (۵/۴۴)

منافقت

ایک انداز یہ بھی ہوتا ہے کہ جب دیکھا جائے کہ خدا کے کسی حکم یا قانون کے مطابق فیصلہ لینے میں

فائدہ ہوتا ہے؛ تو اس کی اطاعت اختیار کر لی جائے۔ لیکن جو قانون اپنے خلاف جاتا ہو، اس سے اعراض برتا جائے۔ قرآنِ کریم اس منافقانہ طرزِ زندگی کو بھی ظلم سے تعبیر کرتا ہے۔ جب وہ کہتا ہے کہ:۔

> بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں اور ان کی اطاعت بھی کرتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کا ایک گروہ اس اطاعت سے روگردانی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ درحقیقت مومن ہے ہی نہیں۔
>
> اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ جب انہیں اس نظام کی طرف بلایا جاتا ہے جسے خدا کے رسول نے احکامِ خداوندی نافذ کرنے کے لئے قائم کیا ہے تاکہ وہ ان کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرے، تو وہ گروہ اس سے اعراض برتتا ہے۔ لیکن اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا تو وہ اس کی اطاعت کے لئے لپک کر آتے ہیں۔
>
> اُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (۲۴/۴۷-۵۰)
>
> یہ لوگ بھی ظالم ہیں۔

غلط نظریۂ زندگی

اصل یہ ہے کہ اس قسم کا منافقانہ انداز اختیار ہی وہ کرتا ہے جسے صحیح نظریۂ زندگی پر ایمان نہ ہو۔ نظریۂ زندگی ہی (جسے قرآن کلمہ کہہ کر پکارتا ہے اور دورِ حاضرہ کی اصطلاح میں جسے آئیڈیالوجی کہا جاتا ہے) انسانی عمل کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار ہوتا ہے۔ غلط نظریۂ زندگی کو نہ خود ثبات ہوتا ہے، نہ ہی اس بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارتِ اعمال استوار ہو سکتی ہے۔ اس لئے قرآنِ کریم نے غلط نظریۂ زندگی کے حاملین کو بھی ظالم کہہ کر پکارا ہے۔ سورۂ ابراہیم میں ہے:۔

> صحیح نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے عمدہ پھل دار درخت کی سی ہے جس کی جڑیں پاتال میں، محکم و استوار، ہوں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں جھولے جھول رہی ہوں۔ وہ درخت، قانونِ خداوندی کے مطابق، ہر زمانے میں، ہر موسم میں، پھل دیئے جاتا ہے۔ اس طرح اللہ بسیط حقائق کو محسوس مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ جائیں۔
>
> اس کے برعکس، غلط نظریۂ زندگی کی مثال ایک ایسے نکمّے درخت کی سی ہے۔ جس کی کھوکھلی سی جڑ، زمین کے اوپر ہی اوپر ہو، کہ اسے جب جی چاہے اکھاڑ کر پھینک دیا جائے۔
>
> اس طرح خدا، اس محکم نظریۂ زندگی کی رُو سے، ایمان والوں کی جماعت کو، ان کی دنیاوی زندگی میں بھی ثبات و تمکن عطا کر دیتا ہے۔ اور اُخروی زندگی میں بھی۔ اس کے برعکس غلط نظریۂ زندگی کے حامل (ظالمین) کی تمام کوششیں رائگاں جاتی ہیں اور یہ

سب کچھ خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ (۱۴/۲۶-۲۷)

دو نظریاتِ حیات

ایک نظریۂ زندگی یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام نہیں۔ اس میں ایک اور چیز بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ جسم کی پرورش اس لئے ضروری ہے کہ زندگی کی موجودہ سطح پر یہ اس کی ذات کا مرکب ہے اور اس کے فیصلوں کو بروئے کار لانے کا ذریعہ۔ زندگی کا حقیقی مقصود انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ اور یہ ان اقدار کی پابندی سے ممکن ہے جنہیں خدا نے اپنی کتاب میں محفوظ کر دیا ہے۔ جس عمل کا جذبۂ محرکہ یہ ہو اسے ثبات و قرار ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ گویا انسان کی ذات کا جزو بن جاتا ہے۔ جو جسم کی موت کے ساتھ فنا نہیں ہو جاتی۔ آگے بھی جاتی ہے۔

اس کے برعکس دوسرا نظریہ یہ ہے کہ زندگی بس اسی جسم کی زندگی ہے۔ اس کے خاتمہ سے خود انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریۂ زندگی کا حامل جو کچھ کرے گا، اس لئے کرے گا کہ اُسے جسم کی پرورش و آسائش کا سامان ہاتھ آ جائے۔ اگر وہ کوئی ایسا کام بھی کرے گا جسے عام اصطلاح میں "نیکی" کہا جاتا ہے تو اس کا جذبۂ محرکہ اپنی نمود و نمائش ہو گا جس سے انسان کے ایگو کی تسکین ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے اعمال کے لئے بقا نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ کریم نے اسے "اپنی ذات پر ظلم" سے تعبیر کیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے:-

> ایسے لوگوں کے پیشِ نظر صرف طبیعی زندگی کی آسائشیں ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لئے جو کچھ صرف کیا جائے اس کی مثال ایسی ہے جیسے شدت کی سرد ہوا چلے اور ان لوگوں کی کھیتی تک جا پہنچے، جنہوں نے قانونِ خداوندی کے مطابق اس کی حفاظت کا سامان نہیں کر رکھا، تو یہ ہوا ان کی کھیتی کو تباہ کر دے گی۔ یہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ یاد رکھو! خدا کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا، لوگ خود اپنے آپ پر ظلم اور زیادتی کرتے ہیں اور اُس کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ (۳/۱۱۶)

غلط معاشی نظام

ظلم کا عام مفہوم یہ ہے کہ دوسروں کے واجبات پورے پورے ادا نہ کئے جائیں۔ ان کے حقوق کی تلفی کی جائے۔ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھا لیا جائے۔ محنت کش کو اس کی محنت کا ماحصل نہ دیا جائے۔ اس میں سے کچھ رکھ لیا جائے۔ دوسروں کی محنت کی کمائی پر تن آسانی اور عیش سامانی کی زندگی بسر کی جائے۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ یہ سب خرابیاں غلط معاشی نظام کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس لئے غلط معاشی نظام، بجائے خویش بہت بڑا ظلم ہے اور اس قسم کے نظام کے حامل سب سے بڑے ظالم۔ قرآنِ کریم میں معاشیات کے متعلق اس قدر وضاحت اور کثرت سے آیا ہے کہ

ضمنی طور پر اس کا احاطہ ممکن نہیں۔ (میں اس سلسلہ میں بہت کچھ لکھ چکا ہوں) اس لئے اس مقام پر اس کے صرف دو ایک گوشوں کو سامنے لایا جائے گا۔ مثلاً سورۃ النحل میں ہے:۔

> قوموں پر تباہیاں کیوں اور کب آتی ہیں، اسے ایک مثال سے سمجھو۔ ایک بستی تھی، جسے خارجی خطرات کی طرف سے امن اور داخلی کش مکش سے اطمینان حاصل تھا۔ اس کی طرف ہر سمت سے سامان رزق کھنچے چلا آتا تھا۔ اس کے رہنے والے بڑے خوشحال اور فارغ البال تھے لیکن انہوں نے خدا کی ان بخشائشوں کی ناقدرشناسی کی۔ (بڑے بڑے لوگوں نے انہیں اپنے لئے سمیٹنا اور چھپانا شروع کر دیا۔) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہاتھوں کا ساختہ پرداختہ تھا۔
>
> ان کی طرف خود انہی میں سے خدا کا ایک پیغامبر آیا۔ لیکن انہوں نے اسے جھٹلایا تو ان پر ہلاکت کا عذاب مسلط ہو گیا۔
>
> اور یہ سب اس لئے ہوا کہ هُمْ ظَالِمُوْنَ ۔ وہ ظالم تھے۔ (۱۶/۱۱۲ - ۱۱۳)

اسی قسم کی مثال اس نے سورۃ کہف (آیات ۳۲ - ۴۳) میں بھی دی ہے اور تباہ ہونے والے کے متعلق کہا ہے کہ هُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۔ اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کی شکل میں سامنے آیا۔

ننانویں دُنبیاں

غلط معاشی نظام کی ایک بنیادی خرابی یہ ہوتی ہے کہ اس میں بڑا سرمایہ، چھوٹے سرمایہ کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں غریب، غریب تر۔ اور امیر، امیر تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ظلم کی یہ وہ شق ہے جسے قرآن کریم نے، حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ کے سلسلہ میں یوں بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ ان کے پاس دو شخص اپنا مقدمہ لے کر آئے۔

> مستغیث نے کہا کہ فریقِ ثانی میرا بھائی ہے۔ اس کے پاس ننانویں دُنبیاں ہیں اس لئے بڑا خوش حال ہے۔ اور میرے پاس صرف ایک دُنبی ہے۔ جو میری معاش کا واحد سہارا ہے۔ اب بجائے اس کے کہ یہ اپنے غریب بھائی کی کچھ مدد کرے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ اپنی ایک دُنبی بھی مجھے دے دے۔ چونکہ امیر آدمی ہے اور صاحبِ اثر۔ اس لئے باتوں میں مجھے دبا لیتا ہے اور دوسرے لوگ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملا دیتے ہیں۔ اب آپ فیصلہ کیجئے کہ کیا اس کا یہ مطالبہ جائز ہے۔
>
> قَالَ لَقَدْ ظَلَمَكَ ۔ داؤدؑ نے کہا کہ اس شخص کا یہ مطالبہ سراسر ظلم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ جب بھی مل جل کر رہتے اور کاروبار میں باہمی شراکت کرتے ہیں تو ان میں سے اکثر کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ (۳۸/۲۳ - ۲۴)

لہٰذا، نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہی ظلم پر اٹھتی ہے۔

ربٰو

بڑا سرمایہ دار دوسروں کی محنت کی کمائی کو کس طرح غصب کر لیتا ہے، اسے قرآنِ کریم نے ربٰو سے تعبیر کیا ہے۔ ربٰو کے معنی صرف سود نہیں۔ اس سے مراد ہے سرمایہ کا معاوضہ لینا خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ قرآنِ کریم کی رُو سے، معاوضہ صرف محنت کا ہو سکتا ہے[1] سرمایہ کا نہیں۔ سود بھی اسی لئے حرام ہے کہ اس میں معاوضہ، سرمایہ کا لیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے، اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ جس نے کسی کو کچھ سرمایہ دیا ہے، اسے صرف سرمایہ واپس لینے کا حق ہے۔ اس سے زائد کچھ نہیں۔ بڑا جامع فقرہ ارشاد فرمایا ہے۔ جب کہا کہ اس طرح سے۔

لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ ۔ (۲/۲۷۹)

نہ تم کسی پر ظلم کرو گے، نہ کوئی تم پر ظلم کرے گا۔

لہٰذا، محض سرمائے کے بدلے میں دوسروں کی محنت سے کچھ لے لینا ظلم ہے۔ (امرِ ربٰو کے متعلق طلوعِ اسلام بابت جون ۱۹۸۴ء میں تفصیلی مقالہ شائع ہو چکا ہے)۔

مُترفین

جو لوگ خود محنت نہیں کرتے بلکہ (اپنے سرمایہ کے زور پر) دوسروں کی محنت کی کمائی غصب کر لیتے، اور اس طرح تن آسانی کی زندگی بسر کرتے ہیں، قرآنِ کریم انہیں مُترفین کہہ کر پکارتا ہے۔ قرآنِ کریم نے ایسی قوم کا کیا انجام بتایا ہے جس میں اس قسم کا معاشی نظام رائج ہو، یہ غور سے دیکھنے کی چیز ہے۔ سورۃ انبیاء میں ہے:-

> ہم نے تم سے پہلے کتنی ایسی قوموں کو تباہ کر دیا جنہوں نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی (کَانَتْ ظَالِمَۃً) وہ تباہ ہو گئیں اور ان کی جگہ دوسری قوموں نے لے لی۔ ان کی غلط روش کے نتائج غیر محسوس طور پر مرتب ہوتے جا رہے تھے اور ان سے کہا جا رہا تھا کہ تم اس روش کو چھوڑ دو، ورنہ تباہ ہو جاؤ گے، لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔ چنانچہ وہ غیر محسوس نتائج آہستہ آہستہ آگے بڑھتے گئے حتیٰ کہ وہ محسوس طور پر اُن کے سامنے آ گئے، تو وہ انہیں دیکھ کر لگے بھاگنے۔
>
> لیکن اس وقت وہ بھاگ کہاں سکتے تھے۔ چنانچہ ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں للکارا اور کہا کہ اب تم بھاگ کر کہاں جا سکتے ہو؟ مت بھاگو اور اُلٹے پاؤں اپنی انہی عیش

---

[1] «محنت کا معاوضہ» نہیں کہنا چاہیئے۔ اسی سے تمام غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔ کہنا یہ چاہیئے کہ محنت کرنے والا اپنی محنت کے ماحصل (سارے کے سارے ماحصل کا) حقدار ہوتا ہے۔

سامانیوں کی طرف چلو (مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ) جنہیں تم نے دوسروں کی کمائی سے حاصل کر رکھا تھا، اور ان محلات کی طرف پلٹو جن میں تم اپنے آپ کو اس قدر محفوظ سمجھا کرتے تھے۔ وہاں چلو، تاکہ تم سے پوچھا جائے (لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ) کہ یہ کچھ کس کی محنت سے بنا تھا اور تمہارا اس پر کیا حق تھا۔

اُس وقت انہیں اس حقیقت کے اعتراف کے بغیر چارہ ہی نہ تھا کہ وہ واقعی ظالم تھے (اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ) اپنے کئے پر سخت متاسف۔

لیکن اُس وقت اس ندامت اور تاسف سے کیا ہو سکتا تھا۔ جب نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو پھر وہ پلٹا نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ برابر چلّاتے رہے کہ جو زیادتیاں انہوں نے کی ہیں وہ ان پر بے حد متاسف ہیں۔ لیکن ہمارے قانونِ مکافات نے انہیں ایسے کر دیا جیسے کٹا ہوا کھیت، یا بجھا ہوا شعلہ۔ (۲۱/۱۱-۱۵)

ان آیات میں بنیادی نکتہ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ہے۔ یعنی یہ لوگ اپنے زعمِ باطل میں مبتلا تھے کہ ہم سے کوئی پوچھنے والا نہیں۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافات نے برملا کہا کہ بتاؤ! تمہیں کوئی پوچھنے والا ہے یا نہیں؟ ان تباہ ہونے والوں کے متعلق دوسرے مقام پر کہا ہے کہ

ان کا یہ حال تھا کہ یہ ظالم اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے لگے رہتے اور دوسروں کا سب کچھ لوٹ کھسوٹ کر لے جاتے، تاکہ ان کی آسودگیوں اور تن آسانیوں میں فرق نہ آنے پائے، خواہ باقی انسانوں پر کچھ ہی کیوں نہ گذرے۔ یہ تھے ان کے وہ جرائم جن کی وجہ سے ان پر تباہی آئی تھی۔

یاد رکھو! خدا نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ کسی بستی کو یونہی اندھا دھند ظلم و زیادتی سے تباہ کر دے، درآں حالیکہ وہاں کے رہنے والے، اپنے اور دوسروں کے حالات کو سنوارنے والے ہوں۔ (تباہ وہی ہوتے ہیں جو ظالم ہوں) (۱۱/۱۱۶-۱۱۷)

باطل

اسی کو قرآنِ کریم نے "دوسروں کے مال کو باطل طریق سے کھا جانے" سے تعبیر کیا ہے۔ (۴/۲۹) اور کہا ہے کہ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا۔ (۴/۳۰) یاد رکھو! جو معاشرہ ظلم و سرکشی سے ایسی روش اختیار کرے گا وہ بہت جلد تباہیوں کی آگ میں جھلس کر رہ جائے گا۔

احبار و رہبان

یوں تو قرآن میں ہر ناجائز طریقہ کو باطل کہا گیا ہے لیکن بنیادی طور پر اس سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں۔

جو کوئی تعمیری کام کرنے کے بغیر مفت میں بیٹھے دوسروں کی کمائی کھاتے رہیں۔ یعنے ایک تو وہ گروہ تھا جو اپنا سرمایہ لگا کر دوسروں کی محنت غصب کرتا تھا۔ لیکن ایک گروہ وہ بھی ہے جو سرمایہ تک بھی نہیں لگاتا، اور دوسروں کی کمائی پر تن آسانی کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ گروہ ہے مذہبی علماء اور روحانی پیشواؤں کا جن کی تصریح قرآن کریم نے ان الفاظ میں کر دی کہ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ
اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۔ (۹/۳۴)

اے جماعتِ مومنین! (ان مذہبی عالموں اور روحانی پیشواؤں سے ہوشیار رہو)، یہ وہ لوگ ہیں جو دوسروں کا مال باطل طریق پر کھا جاتے ہیں۔ عوام بیچارے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف دعوت دینے والے لوگ ہیں۔ حالانکہ ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ لوگ خدا کی راہ کی طرف آنے نہ پائیں، کیونکہ اس سے ان کی پیشوائیت ختم ہو جاتی ہے۔

اس کی وضاحت آگے چل کر یوں کر دی کہ

ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنے خود ساختہ مسلک کو شریعتِ خداوندی کا نام دے کر، لوگوں کو خدا کے سیدھے راستے کی طرف آنے سے روکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے صاف اور سیدھے راستے میں خواہ مخواہ پیچ و خم پیدا کر دیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات اور حیاتِ آخرت پر ان کا ایمان ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے مذہب کو محض بطور پیشہ اختیار کر رکھا ہوتا ہے۔ یہ وہ ظالم ہیں جن پر خدا کی لعنت برستی ہے۔ (۱۱/۱۹-۱۷)

اس طرح دین میں یہ لوگ اختلاف پیدا کر کے، اُمّت کو فرقوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہ وہ ظلم ہے جس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟ سورۂ زخرف میں (حضرت عیسےٰؑ کے تذکرہ کے ضمن میں) ہے:

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ عَذَابِ
يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۔ (۴۳/۶۵)

ان میں مختلف گروہوں نے باہمی اختلاف پیدا کر لیا۔ سو جو لوگ اس طرح ظالم بن جائیں ان کے لئے الم انگیز تباہی کا عذاب ہوتا ہے۔

یعنی اُمّت میں اختلاف پیدا کرنے والے ظالم ہیں اور اس کا نتیجہ عذاب۔

عام جرائم

یہ ظلم کی موٹی موٹی شقیں ہیں۔ ان کے علاوہ، قرآن کریم نے تمام قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی کو ظلم کہہ کر پکارا ہے۔ حتیٰ کہ معاشرتی زندگی کی ان برائیوں کو بھی، جو غلط معاشرہ میں اس قدر عام ہو جاتی ہیں کہ انہیں برائیاں سمجھا ہی نہیں جاتا۔ مثلاً سورۂ حجرات میں ہے:

> اے جماعتِ مومنین! یاد رکھو ایسا کبھی نہ ہو کہ تم میں سے ایک فریق، دوسرے فریق کا مذاق اڑانے لگ جائے اور اُسے ذلیل اور حقیر کرنے کی کوشش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ تم سے بہتر ہی ہوں ———— نہ تمہارے مرد یہ کچھ کریں نہ عورتیں۔ نہ ہی تم ایک دوسرے کے خلاف عیب لگاؤ (بہتان تراشی کرو) نہ طعن و تشنیع کرو۔ نہ ایک دوسرے کے اُلٹے پلٹے نام رکھو۔ جب تم ایمان لا کر بلند اخلاق کے حامل بننے کا تہیّہ کر چکے ہو تو پھر آپس میں ایک دوسرے کے بُرے نام رکھنے کا کیا مطلب؟ یہ بُری بات ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے ایسا کیا ہے تو اسے اپنے کئے پر نادم ہو کر فوراً اس روش کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اس کا شمار ظالمین میں ہو جائے گا۔ (۴۹/۱۱)

اس سے اگلی آیت میں یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ حسنِ ظن سے کام لو اور بدگمانی سے بچو۔ نہ ہی کسی کے رازکی باتوں کی ٹوہ میں لگے رہو، نہ ہی ایک دوسرے کی غیبت کرو۔ یہ سب برائیاں ایسی ہیں جو ظلم کی شق میں آ جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کا مذاق اڑائیں اور انہیں (SERIOUSLY) نہ لیں، انہیں بھی ظالم قرار دیا گیا ہے، اور ان سے کنارہ کش رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ (۶/۶۸)

عدالتی نظام میں، مجرم کو اس کے جرم سے زیادہ سزا دینا بھی ظلم ہے۔ (۶/۶۱)

———— (٠) ————

ظلم اور ہم

یہ ہیں ظلم کی نوعیتیں جو قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں بیان ہوئی ہیں۔ آپ انہیں سامنے رکھیئے اور پھر سوچیئے کہ ان میں سے کوئی شق بھی ایسی ہے جو ہمارے معاشرہ میں (نہ صرف یہ کہ پائی نہ جاتی ہو بلکہ) عام نہ ہو چکی ہو! اس حقیقت کو سامنے رکھیئے اور پھر قرآنِ کریم کے ان حتمی اور یقینی اعلانات کو سامنے لایئے، جنہیں اس نے اپنے غیر متبدل قوانین کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ یعنے یہ کہ

ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ (۶/۲۱)

ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ (۲۸/۳۷)

ظالم قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ (۶/۴۷)

وہ زندگی کی خوشگواریوں سے محروم رہ جاتی ہے۔ (۷/۴۴)

اس کی جڑ کٹ جاتی ہے اور انسانیت اس پر خدا کا شکر ادا کرتی ہے۔ (۶/۴۵)

قرآنِ کریم نے یہ اصول اور قانون بیان کیا اور اس کی صداقت کی شہادت میں، وہ اقوامِ سابقہ کی سرگذشتوں کو سامنے لایا۔ اس لئے قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم مدین، قوم لوط، قوم فرعون۔ غرضیکہ تمام اقوامِ سابقہ کی تاریخ پیش کی ہے اور واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ جب ان کے معاشرہ میں ظلم عام ہو گیا تو وہ تباہ ہو گئیں۔ وہ ان کے انفرادی تذکرہ کے بعد، بہ حیثیتِ مجموعی کہتا ہے کہ

یہ اقوامِ گذشتہ میں سے چند ایک کی سرگذشت ہے، جسے ہم، تم سے بیان کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض آبادیاں تو ابھی تک موجود ہیں اور باقی اُجڑ چکی ہیں۔

تم نے ان کے حالات سے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم نے ان پر کسی قسم کی زیادتی نہیں کی۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر زیادتی کی تھی۔ سو جب ان کے اعمال کے نتائج کے ظہور کا وقت آ گیا تو وہ جن غیر خداوندی قوتوں کے احکام کی اطاعت کیا کرتے تھے اور انہیں اپنا خدا سمجھے بیٹھے تھے، وہ ان کے کسی کام بھی نہ آ سکیں۔ ان کی اطاعت اس سے زیادہ کچھ نہ کر سکی کہ وہ الٹا ان کی تباہی کا موجب بن جائے۔

لہٰذا، تاریخ کے ان نوشتوں سے تم اِس محکم اصول کو یاد رکھو، کہ جب بھی کسی قوم میں ظلم عام ہو جائے تو وہ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی گرفت میں آ جاتی ہے اور یہ گرفت بڑی سخت اور الم انگیز ہوتی ہے۔

اقوامِ گذشتہ کی ان داستانوں اور قانونِ مکافات کے اِس غیر متبدل اصول میں اُس قوم کے لئے واضح دلائل ہیں جو مستقبل کی تباہیوں کے احساس سے خائف رہتی ہے اور اس سے بچنا چاہتی ہے۔ (۱۱/۱۰۰-۱۰۲)

اس میں دوسروں کے لئے سامانِ عبرت اس لئے ہے کہ یہ محض اقوامِ سابقہ کے کوائف اور اخبار (CHRONICLE) نہیں جنہیں اساطیر الاولین (پرانے زمانے کے لوگوں کی کہانیاں) سمجھ کر پڑھ لیا جائے۔ یہ تو خدا کے اس قانون کی زندہ شہادات ہیں کہ جس قوم نے بھی ظلم کی روش اختیار کی اس کا انجام یہ ہوا۔ اس لئے جو قوم بھی اِس قسم کی روش اختیار کرے گی اس کا انجام اسی قسم کا ہوگا۔

فَاِنَّ لِلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ (۵۱/۵۹)

ہر زمانے کے ظالمین کا انجام وہی ہوگا جو ان سے پہلے زمانے کے ظالمین کا ہوا تھا۔

فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِیْثَ (۳۴/۱۹) وہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں اور ان کی صرف داستانیں باقی رہ جاتی ہیں۔ وَمَزَّقْنٰهُمْ کُلَّ مُمَزَّقٍ (۳۴/۱۹) ان کی ہیئتِ اجتماعیہ ختم ہو جاتی ہے اور ان کے افراد اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے باقی رہ جاتے ہیں جو اپنی مٹی ہوئی عظمت کی عبرتناک یادگار ہوتے ہیں اور اپنے ماضی کی لاشوں کو اپنے کندھوں پر اٹھائے دربدر مارے مارے پھرتے رہتے ہیں۔ اقوامِ سابقہ کی ان داستانوں کے بیان کرنے سے قرآن کا مقصد یہی ہے۔ وہ ہر داستان کے بعد ہم سے کہتا ہے کہ:

فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِیْنَ (۱۰/۳۹)

دیکھو! ظالمین کا انجام کیسا ہوا؟

وہ کہتا ہے کہ تم یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب نہ دے لینا کہ وہ قومیں کمزور تھیں۔ انہوں نے اپنے وسائلِ پیداوار کو ترقی دے کر، ان سے کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا تھا، اس لئے وہ تباہ ہو گئیں۔ یہ خیال غلط ہے۔

وہ قومیں شان و شوکت میں (تمہاری ان مخاطب قوموں) سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں، انہوں نے زمین

کے سینے کو چیر کر اس میں چھپے ہوئے خزانوں کو باہر نکالا ـــــ ملکوں کو آباد کیا ـــــ اُن کی آبادیاں، اِن کی آبادیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تباہ ہو گئیں۔ اس لئے نہیں کہ خدا نے انہیں یونہی ظلم و تعدی سے تباہ کر دیا۔ خدا کبھی ایسا نہیں کرتا۔ وہ تباہ اس لئے ہوئیں کہ (كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ) انہوں نے اپنے آپ پر ظلم کر رکھا تھا۔ (۳۰/۹)

نہ ہی یہ تھا کہ وہ کوئی جاہل، وحشی، یا غیر مہذب قومیں تھیں جو امورِ سیاست سے بے بہرہ اور علم و بصیرت سے بیگانہ تھیں۔ بالکل نہیں۔

> وہ غیر مہذّب اور وحشی قومیں نہیں تھیں۔ انہیں علم و دانش کے تمام ذرائع ـــــ سماعت، بصارت اور قلب ـــــ حاصل تھے۔ لیکن چونکہ ان کی روش ظالمانہ تھی اس لئے ان کی عقل و بصیرت اور فہم و فراست ان کے کسی کام نہ آئی اور جس انجام کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ تباہ ہو گئیں۔ (۴۶/۲۲)

اپنے آپ پر ظُلم

ہم نے اوپر (آیت ۳۰/۹ میں) دیکھا ہے کہ قرآن یہ کہتا ہے کہ ان تباہ ہونے والی قوموں پر خُدا نے ظلم و زیادتی نہیں کی تھی۔ "انہوں نے خود اپنے آپ پر زیادتی کی تھی" (كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ) قرآنِ کریم نے یہ اصطلاح، ظلم کے سلسلہ میں اکثر و بیشتر استعمال کی ہے اور یہ ایک عظیم حقیقت ہے جسے قرآن سادہ سے انداز میں پیش کرتا ہے۔ ظالم سمجھتا یہ ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچا رہا ہے' لیکن اگر وہ ذرا بہ نظرِ تعمق دیکھے تو اُسے نظر آ جائے کہ وہ کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا رہا بلکہ خود اپنی ذات کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ وہ بزعمِ خویش دوسروں کو تباہ کرتا ہے لیکن درحقیقت اپنے آپ کو تباہ کر رہا ہوتا ہے۔ مستبد حکمران اپنے مخالفین کو ہر طریق سے اذیت پہنچاتا اور تباہ کرتا ہے۔ اسی طرح بالادست قوم، کمزور قوموں کو کچلتی اور اس میں بڑی لذّت محسوس کرتی ہے۔ لیکن اس ظلم و تعدی سے وہ درحقیقت خود اپنی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم ہر تباہ ہونے والی قوم کی داستانِ عبرت و موعظت بیان کرنے کے بعد، واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ (۱۱/۱۰۱)

ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم و زیادتی کی تھی، جس کی وجہ سے وہ تباہ ہو گئے۔

تباہی کہاں سے آتی ہے؟

یہ قومیں عقل و شعور کی مالک ہوتی ہیں۔ اس لئے اپنی طرف سے پورا پورا انتظام کر لیتی ہیں کہ ان پر کہیں سے تباہی نہ آنے پائے۔ وہ سیاسی تدبّر کی فسوں سازیوں سے، ایسے تمام راستے بند کر لیتی ہیں۔

جن سے وہ سمجھتی ہیں کہ ان کی تباہی کے اسباب آسکتے ہیں۔ وہ ہر ممکن خطرہ کی روک تھام کے لئے احتیاطی تدابیر اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ، ہر سر اٹھانے والے کا سر، قبل اس کے کہ وہ سر اٹھے، کچل کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ اپنی طرف سے اپنی حفاظت کا سارا اہتمام کر لیتی ہیں۔ وہ اپنی سیاست کے محکم قلعوں میں (بزعمِ خویش) مصئون و مامون ہو کر بیٹھ جاتی ہیں، لیکن نہیں سمجھتیں کہ ان قلعوں کی بنیاد میں خرابی کی ایک صورت مضمر ہے جو اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کئے جا رہی ہے۔ چنانچہ، اُن کی ان تمام تدابیر کے علی الرغم، ان پر تباہی کا عذاب ان راستوں سے آ جاتا ہے جو ان کی عقل و شعور تک میں نہیں پہنچے۔ قرآن کے الفاظ میں:-

> جو کچھ یہ کر رہے ہیں، کوئی نئی بات نہیں۔ ان سے پہلی قوموں نے بھی اسی قسم کی ڈپلومیٹک تدابیر اختیار کر رکھی تھیں کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے نہ پائے۔ لیکن خدا کے قانونِ مکافات نے ان کے نظامِ تمدّن کی بنیادوں تک کو ہلا دیا، اور اس کی چھتیں ان کے اوپر آ کر گریں۔ انہوں نے اپنی طرف سے تباہی کے تمام راستے بند کر رکھے تھے۔ لیکن تباہی ان پر ان راستوں سے آ پہنچی (مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ) جو ان کی عقل و شعور تک میں نہ تھے۔ (۱۶/۲۶)

تباہی کی شکلیں

یہ تباہی کن شکلوں میں آتی ہے۔ اس کے متعلق کہا کہ

> کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سوسائٹی کے اوپر کے طبقہ میں خرابیاں عام ہو جاتی ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ کبھی نیچے کے طبقہ میں لاقانونیت پھیل جاتی ہے تو وہ تباہی مچا دیتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ یہ دونوں طبقے مخلوط پارٹیاں بنا لیتے ہیں، اور ایک دوسرے سے لڑ کر تباہ ہو جاتے ہیں۔ (۶/۶۵)

ظلم کا اس قسم کا انجام فطرت کے ہاتھوں عمل میں آتا ہے جس میں تخریب ہی تخریب ہوتی ہے۔ لیکن یہی انقلاب جب ایک ایسی جماعت کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے جو اقدارِ خداوندی کے مطابق اپنا اجتماعی نظام قائم کرتی ہے تو اس میں ظالموں کی تباہی کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی تعمیرِ نَو ہوتی جاتی ہے جس میں عدل و انصاف کا دَور دَورہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے (سورۂ شعراء میں) ”زندگی سے شاعری کرنے والی“ جماعتوں کے مقابلہ میں، قومِ مومنین کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے :-

> ان کے برعکس، وحی پر ایمان لانے والے ہیں جو ایک متعیّن نصبُ العین پر یقین رکھتے ہیں اور ایسے پروگرام پر عمل پیرا رہتے ہیں جو ان کی اپنی ذات کی صلاحیتوں کی بھی نشوونما کرے اور دنیا کے بگڑے ہوئے کام بھی سنوارے۔ وہ زندگی کے ہر گوشے میں قوانینِ خداوندی کو سامنے رکھتے ہیں۔ انہیں کبھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے جب

ان پر کوئی ظلم و زیادتی کرتا ہے تو وہ شاعروں کی طرح اس کی ہجو لکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا نہیں کر لیتے بلکہ اس سے اس ظلم و زیادتی کا بدلہ لیتے ہیں اور ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں ظلم و زیادتی کرنے والے بدلگام نہ پھرتے رہیں بلکہ انہیں نظر آجائے کہ ان کا صحیح مقام کونسا ہے جس کی طرف انہیں لوٹا کر لایا جائے گا۔ اس کو انقلاب کہا جاتا ہے۔ (۲۶/۲۲۷)

قوموں کی تباہی سے یہ مراد نہیں ہوتی کہ اُن کا کوئی فرد باقی نہیں رہتا۔ اس سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ ان کی شان و شوکت، قوت و ثروت، عزت و عظمت، حکومت و سطوت چھن جاتی ہے اور وہ دنیا میں ذلّت و خواری کی زندگی بسر کرتی ہے۔

فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْیَ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا...... (۳۹/۲۶)

اُن کے ظلم کا نتیجہ یہ تھا کہ انہیں اسی دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنی پڑی۔
(اور مستقبل کا عذاب اس سے کہیں زیادہ ہوگا)

دوسرے مقام پر کہا ہے کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ (۱۶/۱۱۲) — "ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا" یعنی وہ اپنی روٹی تک کے لئے دوسری قوموں کے محتاج ہو گئے اور انہیں اپنی ملّی ہستی کی حفاظت کی طرف سے ہر وقت دھڑکا لگا رہا۔ یہ ہیں قوموں کی تباہی کی علامات۔ سورۂ طٰہٰ میں قرآن کریم نے اسے ایک ایسے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے اجمال میں ہزار تفاصیل پوشیدہ ہیں۔ کہا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا۔ (۲۰/۱۱۱) — اَلْخَیَابُ اس چقماق کو کہتے ہیں جس سے آگ کی چنگاری نہ نکلے۔ یعنی ظلم کرنے والی قوموں کی کیفیت اس چقماق کی سی ہو جاتی ہے جس کی شکل و صورت تو ویسی کی ویسے ہی رہے لیکن اس میں زندگی بخش حرارت باقی نہ رہے۔ وہ شعلۂ افسردہ کی طرح ہو جائے۔ وہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائے۔

مُہلت کا وقفہ

آپ نے اکثر لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہوگا کہ آپ کہتے ہیں کہ ظالم پنپ نہیں سکتا، لیکن ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ ظالم دن رات پنپتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا ہر پروگرام کامیاب ہوتا ہے۔ وہ کھلے بندوں دندناتے پھرتے ہیں اور کوئی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ افراد کا بھی یہی حال ہے اور اقوام کی بھی یہی کیفیت۔ جو قوم قوت فراہم کر لے، وہ دوسری قوموں کے خلاف جو جی میں آئے کرے، اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ مظلوم اور کمزور پستے چلے جاتے ہیں، اور ظالم اور قاہر بپھرے پھرتے ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ یہ تمہاری نگاہ کی کمزوری ہے جو صرف چند قدموں تک دیکھ سکتی ہے، اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ اگر تمہاری حدِ نگاہ وسیع ہوتی تو تم دیکھ لیتے کہ ظالم، انجامِ کار، تباہ و برباد ہو کر رہتا ہے۔

بات یہ ہے کہ خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے، عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس شکل میں سامنے آنے میں ایک مدت ہوتی ہے، جسے مہلت کا وقفہ کہا جاتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ تو اس کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ محسوس شکل میں ایک مُدت کے بعد جا کر سامنے آتا ہے۔ تمہاری نگاہ اس "مُہلت کے وقفہ" میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے اور تم خیال کر لیتے ہو کہ ظلم نتیجہ خیز نہیں ہو رہا۔ بس یہ ہے تمہاری بھول۔ سورۂ ابراہیم میں ہے۔

> تم اس کا وہم و گمان تک بھی نہ کرو کہ یہ ظالم اور سرکش لوگ جو کچھ کر رہے ہیں ہم اس سے بے خبر ہیں۔ ہمارا قانونِ مکافات سب کچھ دیکھ رہا ہے لیکن یہ وقفہ مہلت کا ہے۔ جب ظہورِ نتائج کا وقت آ جائے گا، اس وقت تباہیوں کو اپنے سامنے بے نقاب دیکھ کر ان کی حالت یہ ہو جائے گی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ افرا تفری کا یہ عالم ہوگا کہ یہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر، منہ اٹھائے، بدحواس بھاگے چلے جائیں گے۔ سب ان کا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ حتیٰ کہ ان کی نگاہ بھی کاشانۂ چشم میں لوٹ کر نہیں آئے گی۔ ان کے دل امیدوں سے خالی ہو جائیں گے۔ یاس انگیز تاریکیاں ان پر بُری طرح چھا جائیں گی۔
>
> (۱۴/۴۲-۴۳)

دوسرے مقام پر اس قانونِ تدریج و امہال کی حکمت بھی بیان کر دی جہاں کہا کہ:۔

> اگر کائنات کے ارتقاء میں تدریجی قانون کارفرما نہ ہوتا، اور قانونِ مکافات لوگوں کے ظلم و زیادتی پر ان کی فوری گرفت کر لیا کرتا، تو صفحۂ ارض پر کوئی چلنے والا انسان نظر نہ آتا۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ انہیں مقررہ تاریخی منازل تک پہنچانے کے لئے ان کے انجام کو مؤخر کرتا جاتا ہے اور جب وہ اپنے مستقر تک پہنچ جاتے ہیں تو اس کے بعد نہ ایک ثانیہ کی دیر ہوتی ہے، نہ سویر۔ ان کے اعمال کا آخری فیصلہ کن نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔
>
> (۱۶/۶۱)

اسی کو قرآن نے "پلڑا جھکنے" (ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ) سے تعبیر کیا ہے۔ قوموں کو سرفرازی اُس وقت نصیب ہوتی ہے جب ان کے تعمیری کاموں کا پلڑا جھکا ہوتا ہے۔ اس کے بعد، ان کی تخریبی کارستانیاں شروع ہو جاتی ہیں تو تعمیری پلڑا آہستہ آہستہ اوپر کو اُٹھنا شروع ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں اگر وہ اپنی اصلاح کر کے تعمیری کاموں کے وزن میں اضافہ کر لیں تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہیں۔ (مہلت کے وقفہ سے دراصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہلاکت سے پہلے، بازآفرینی کا موقع بہم پہنچایا جائے) لیکن اگر وہ اپنی روش سے باز نہیں آتیں، تو تخریبی پلڑا بھاری ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور جب وہ تعمیری پلڑے کے مقابلہ میں، زیادہ جھک جاتا ہے، تو قوم پر تباہی آ جاتی ہے۔ اس وقت بازیابی کا موقعہ باقی نہیں رہتا۔ تباہی کے اس طرح محسوس شکل میں سامنے آنے سے، انہیں خدا کے قانونِ مکافات کی صداقت کا یقین آ جاتا ہے لیکن اس وقت یہ احساس و یقین انہیں کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ دیکھئے

سورۂ مومن میں اس حقیقت کو کس قدر واشگاف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

اگر یہ لوگ اس امر کا مشاہدہ کرنا چاہتے ہیں کہ ظلم و تعدی سے قومیں کس طرح تباہ ہوا کرتی ہیں، تو ان سے کہو کہ ذرا دنیا میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو قومیں تم سے پہلے ہو گزری ہیں، ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھے اور قوت میں بھی ان سے بڑھ چڑھ کر۔ انہوں نے زمین سے پیدا ہونے والے سامانِ زیست پر بھی ان سے کہیں زیادہ تصرف حاصل کر رکھا تھا لیکن ان کا مال و دولت اور ان کی ہنرمندی اور کاریگری، انہیں ان کے غلط اعمال کے تباہ کن نتائج سے بچا نہ سکے۔ وہ سب دھرے کا دھرا رہ گیا۔

جب ان کے رسول ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے انکی تکذیب کی، اور اپنے علم و ہنر پر نازاں رہے۔ (یعنی کہا کہ تم غلط کہتے ہو کہ ہماری موجودہ روش ہمیں تباہ کر دے گی۔ ہمیں کوئی تباہ نہیں کر سکتا۔ ہم نے سب ٹھیک ٹھاک کر رکھا ہے) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں آدبوچا۔

جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو چلا اٹھے اور کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن قوتوں کو ہم اس کے شریک سمجھتے تھے، ان سے انکار کرتے ہیں۔

لیکن اس ایمان نے انہیں کچھ فائدہ نہ دیا جسے وہ عذاب کو دیکھ کر لائے تھے۔ ایمان وہی نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے جو ظہورِ نتائج سے پہلے لایا جائے کیونکہ اس صورت میں ہنوز وقت ہوتا ہے کہ انسان، تعمیری کاموں سے، سابقہ تخریبی اعمال کے مضر اثرات کا ازالہ کر سکے۔

(۹۰/۸۲-۸۵)

اور اس کے بعد ہے:-

سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ قَدْ خَلَتْ فِیْ عِبَادِهٖ (۴۰/۸۵)

یہ خدا کا وہ قانون ہے جو انسانوں پر شروع سے نافذ ہوتا چلا آ رہا ہے۔

فرمایا:-

اس وقت نہ تو ان کا ایمان کچھ کام دے سکے گا اور نہ ہی ان کا چیخنا چلاّنا کچھ کفایت کر سکے گا۔ یہ مدد کے لئے چیخیں چلاّئیں گے، اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ایک بار یہاں سے نکال دے، پھر دیکھ کہ ہم کس طرح اپنی سابقہ روش کے خلاف، تیرے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اچھے کام کرتے ہیں۔

ان سے کہا جائے گا کہ کیا تمہیں اتنی عمر نہیں دی گئی تھی کہ تم میں سے جو ہمارے قانون کے مطابق نصیحت حاصل کرنا چاہتا ہے وہ اس کے لئے کافی ہو جاتی ہے؛ اور پھر تمہارے پاس وہ پیغامبر بھی آ گیا تھا جو تم سے پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ تمہاری روش تمہیں تباہی کے

جہنم کی طرف لے جائے گی۔ لیکن تم نے اس کی ایک نہ مانی۔ سو اب تم اپنے اعمال کے نتائج بھگتو۔ اب کوئی تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ ظلم کرنے والوں کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔
(۴۵/۳۴)

کارگہِ کائنات کیوں سرگرمِ عمل ہے؛

ہمارے سامنے لوگوں کے غلط اعمال کی سزا کے لئے دنیا کا عدالتی نظام ہی ہوتا ہے جو ناقص بھی ہو سکتا ہے اور خائن (بددیانت) بھی۔ یہ جو ہم دیکھتے ہیں کہ ظلم کرنے والے دندناتے پھرتے اور دن بدن پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں، اور انہیں کوئی روکنے ٹوکنے والا ہی نہیں، تو یہ دنیاوی نظامِ عدل کا نقص ہے۔ لیکن خدا نے جب کہا کہ "ظالم پنپ نہیں سکتا" تو وہ اس کے لئے ہمارے نظامِ عدل کا محتاج نہیں ہوتا۔ اس کا اپنا نظام ہے جو نہ ناقص ہے نہ خائن۔ اس کی نتیجہ خیزی اٹل ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے:-

وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ۔ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔ (۴۵/۲۲)

سلسلۂ کائنات اس لئے بالحق پیدا کیا گیا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا رہے اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو۔ (نیز ۱۹/۴۶ ؛ ۲۴/۴۳ ؛ ۱۹/۴۰)

"کسی پر کسی قسم کا ظلم و زیادتی نہ ہو" ـــــ یہ ہے مقصدِ تخلیقِ کائنات ـــــ اسی کا نام خدا کا قانونِ مکافاتِ عمل ہے، جسے عوام کی زبان میں "خدا کی چکی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

یہ چکی پیستی تو بے شک بہت باریک ہے لیکن اس کی رفتار (ہمارے حساب و شمار کے مطابق) بہت سست ہوتی ہے۔ اور مظلوم کی یہ انتہائی آرزو ہوتی ہے کہ وہ ظالم کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ یہ تجھ سے کہتے ہیں کہ وہ تباہی جلد آنی چاہیئے۔ وہ تباہی ضرور آئے گی۔ خدا کا قانون اٹل ہے لیکن اس کی رفتار (ان کے معیار کی رو سے) سست ہے۔ خدا کا ایک دن، تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔
(۲۲/۴۷)

اب اس کا کیا کیا جائے؟ مظلوم کے دل کی پکار رہ رہ کر کہتی ہے کہ:-

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

یہ ہے "بیتابیٔ تمنا اور صبر طلبیٔ عشق"[1] کی وہ کشمکش، جس کے حل کے لئے قرآن چاہتا ہے کہ دنیا میں خود انسانوں کے ہاتھوں ایک ایسا نظام قائم ہو جو لوگوں کے اعمال کی نتیجہ براری میں تو، نظامِ کائنات

---

[1] عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب ؎ دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک (غالب)

کے حائل ہو، لیکن اس کی رفتار سست نہ ہو۔ اس کا نام دین کا نظام، یا اسلامی مملکت ہے جس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ ــــ لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ ۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ـــ ہر متنفس کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے، اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہ ہو، اس نظام کو سب سے پہلے، حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے متشکل کر کے دنیا کو دکھا دیا کہ خدا کا وہی دن، جو نظامِ کائنات میں ایک ایک ہزار سال کا ہوتا ہے، اس نظام میں کس طرح چوبیس گھنٹے کا بن جاتا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو دنیا کے کسی جابر اور ظالم سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ اس نظام کے داعیؐ کو آگاہ کر دیا گیا کہ یاد رکھو۔

یہ لوگ چاہیں گے کہ اگر تم تھوڑا سا اُن کی طرف جھک جاؤ تو یہ تمہاری طرف جھک جائیں دیکھنا، ایسا نہ کرنا۔ (۶۸/۹)

وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ (۱۱/۱۱۳) اگر تم ان ظالمین کی طرف ذرا سا بھی جھک گئے اور اس طرح ان سے مفاہمت کر لی، تو یاد رکھو تم بھی اسی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے جس میں یہ لوگ ماخوذ ہیں ـــ تمہارا نظام عدل پر مبنی ہے اور عدل اگر ذرا سا بھی ظلم کی طرف مائل ہو جائے تو وہ عدل نہیں رہتا، ظلم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب انہوں نے مفاہمت کی کوشش کی، تو اس نظام کے داعیٔ برحقؐ نے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میں قوانینِ خداوندی میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ میں تو خود انہی کا اتباع کرتا ہوں۔

اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ۔ (۱۰/۱۵)

اگر میں بھی قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کروں تو مجھے اس کے نتیجے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ میں بھی اسی عذاب کی لپیٹ میں آ جاؤں گا۔

یہ تھا وہ نظام، جس کے متعلق اعلان کر دیا کہ یاد رکھو۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۔ (۲/۴۸)

اس میں کوئی شخص کسی کے جرم کا ذرا سا بھی بوجھ نہیں بٹا سکے گا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا خود بھگتنی پڑے گی۔ نہ ہی کسی کی شفاعت کسی کے کام آ سکے گی، نہ ہی کسی سے اس کے جرم کے معاوضہ میں کچھ رشوت لے کر اُسے چھوڑ دیا جائے گا۔ نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کا حمایتی بن سکے گا۔

دنیا کے نظامِ عدل کی رُو سے، اگر کسی مقدمہ کا فیصلہ مروّجہ قانون کے مطابق ہو جائے، تو عدل کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم اس سے بھی ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلہ عدل کہلائے گا لیکن اگر وہ خود قانون ہی ظلم اور ناانصافی پر مبنی ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل قرار پا سکتا ہے؟ لہٰذا، وہ اس نظام کے متعلق جس کا ذکر اوپر کیا گیا

ہے کہنا ہے کہ اس میں قانون سازی کا اختیار انسانوں کو حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اصولی طور پر قوانین، خدا کے نازل کردہ ہوتے ہیں اور وہ نظام ان کے مطابق فیصلے کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

یَهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ یَعْدِلُوْنَ۔ (۷/۱۵۹)

یہ لوگ دوسروں کو حق کی راہ بتاتے ہیں اور اسی کے مطابق عدل کرتے ہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے، جسے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے وہ لوگ ظالم ہیں جو "مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ" کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ (۵/۴۵)

* * *

بازخویشتن نگر

ظلم کی مختلف نوعیتیں، جنہیں قرآنِ کریم نے اس شرح و بسط سے بیان کیا ہے، ہمارے سامنے آگئیں۔ آپ انہیں دیکھئے اور سوچئے کہ ان میں کوئی شق بھی ایسی ہے جو آج ہمارے معاشرے میں نہ پائی جاتی ہو؟ آپ دیکھیں گے کہ ظلم کی ان شقوں کا ہمارے ہاں پایا جانا تو ایک طرف، یہ ہمارے معاشرہ کا معمول بن چکی ہیں اور اس قدر عام ہو چکی کہ ان سے اب ہمارے دل میں کھٹک تک پیدا نہیں ہوتی ——— اگر کھٹک پیدا ہوتی ہے تو صرف اس وقت جب کوئی دوسرا ہم پر زیادتی کرے۔

اس کے بعد، آپ پھر وہیں چلے چلیئے جہاں سے بات شروع کی گئی تھی۔ یعنی ایک ذہنیت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ ظالم پنپ نہیں سکتا ——— ظلم کا انجام تباہی ہوتا ہے، کمزوروں اور ناتوانوں کی خود فریبی ہے جو فرد یا قوم، قوت حاصل کر کے اپنی مدافعت کا سامان مہیا کر لیتی ہے، اسے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دنیا کا یہی چلن رہا ہے، یہی چلن رہے گا۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں سارا زور اپنی قوت اور مدافعت کا سامان مہیا کرنے پر دیا جائے گا۔ ظلم و جبر سے رُکنے کا خیال کبھی پیدا نہیں ہوگا۔

دوسری ذہنیت یہ ہے کہ خدا کا یہ اٹل قانون ہے کہ ظالم کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اور جس معاشرہ میں ظلم کا چلن عام ہو، وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے خواہ اس نے اپنی حفاظت اور مدافعت کے کتنے ہی انتظامات کیوں نہ رکھے ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسے معاشرہ میں، ساری کوشش ظلم سے رُکنے اور اسے روکنے کی کی جائے گی۔

اوّل الذکر ذہنیت کا نام خدا کا انکار (کفر) ہے۔ اور دوسری کو خدا پر ایمان (اسلام) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ ہمارا شمار کس زمرے میں ہو سکتا ہے؟ اس کے ساتھ ہی اسے بھی اچھی طرح سمجھ لیجئے، کہ قانونِ خداوندی کے اٹل ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اگر آپ اس پر ایمان رکھتے ہیں تو وہ اپنا نتیجہ پیدا کرے گا۔ اور اگر آپ اسے صحیح تسلیم نہیں کرتے تو وہ معطل ہو جائے گا۔ قطعاً نہیں۔ وہ قانون بہرحال اور بہرحیثیت اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہے گا خواہ آپ اسے صحیح مانیں یا

نہ مانیں۔ سنکھیا بہرحال مہلک ہے، خواہ آپ اس کی ہلاکت آفرینی کو صحیح تسلیم کریں یا جھوٹ سمجھیں ——— اور سنکھیا اس شخص کو بھی اسی طرح ہلاک کرے گا جو زبان سے اس کی ہلاکت آفرینی کا اقرار کرے لیکن پھر بھی اُسے پھانک لے، جس طرح اس شخص کو ہلاک کر دے گا جو اُس کی ہلاکت آفرینی کا کھلے بندوں انکار کرتا ہوا اُسے چاٹ لے۔ لہٰذا، اگر خدا کا یہ قانون اٹل ہے۔ اور اس کے اٹل ہونے میں شبہ ہی کیا ہے ——— (کہ جس قوم میں ظلم عام ہو جائے وہ تباہ ہو جاتی ہے) اور ہماری روش یہی رہی، تو "پاکستان زندہ باد" کے ہزار نعروں، اور "ملّتِ اسلامیہ، پائندہ باد" کی لاکھ تمناؤں کے باوجود، ہم تباہی سے بچ نہیں سکتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بیرونی خطرات سے ملک کی حفاظت کا انتظام نہایت ضروری ہے، اور ایسا انتظام ضرور کرنا چاہیئے اور ملک کے ہر باشندے کو اس میں پورا پورا حصّہ لینا چاہیئے (کہ اپنی سرحدوں کو مضبوط و مستحکم رکھنے کا حکم بھی خداوندی ہے) اس میں بھی کلام نہیں کہ ملک کی خوشحالی اور فارغ البالی کے لئے مادی ترقی بھی نہایت ضروری ہے (کہ بھوک کو خداوند کریم نے عذاب قرار دیا ہے) لیکن، ان تمام انتظامات و اہتمامات کے باوجود، ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اگر ہم نے اپنے معاشرہ میں ظلم کی بڑھتی ہوئی رَو کو نہ روکا، تو یہ انتظامات و اہتمامات ہمیں تباہی سے کبھی نہیں بچا سکیں گے، نہ ہی ہماری بے رُوح نمازیں اور ہمارے روزے، ہمارا حج اور ہماری زکوٰۃ، ہماری نذریں، اور ہماری نیازیں، ہمارے وعظ اور ہمارے خطبے، ہمیں اس تباہی سے محفوظ رکھ سکیں گے، کہ خدا نے یہ کہیں نہیں کہا کہ ظالم قوم کی رسمی مذہب پرستی اسے ظلم کی آوردہ تباہی سے بچا لے گی۔

ظلم کے انجام کے سلسلے میں ہم عام طور پر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں جس کا ازالہ ضروری ہے۔ ہم یہ کہہ کر اپنے آپ کو اطمینان (یعنی فریب) دے لیتے ہیں کہ ہم تو کسی پر ظلم نہیں کرتے اس لئے ہم پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی۔ خدا کے عذاب میں وہی لوگ ماخوذ ہوں گے جو ظلم کرتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ جب کسی معاشرہ میں ظلم عام ہو جائے اور اس کی وجہ سے قوم پر تباہی آ جائے تو اس سے ساری کی ساری قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ جب سیلاب آتا ہے تو وہ نہ شریف اور بدمعاش کے گھر میں تمیز کرتا ہے، نہ مسجد اور مندر میں تفریق۔ وہ سب کو یکساں اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور صفایا کرتا چلا جاتا۔ اسی لئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ:-

وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (۸/۲۵)

اس تباہی سے اپنے آپ کو (قبل از وقت) بچاؤ کہ جب وہ آتی ہے تو پھر انہی لوگوں تک محدود نہیں رہا کرتی جنہوں نے ظلم کیا تھا۔

جب کسی ناعاقبت اندیش کے کشتی میں چھید کر دینے سے کشتی میں پانی بھر جاتا ہے، تو اس سے صرف وہی شخص نہیں ڈوبا کرتا جس نے کشتی میں چھید کیا تھا ——— کشتی کے تمام مسافر ڈوب جایا کرتے ہیں۔

اس لئے ظلم کی رو کو روکنے کا اہتمام کرنا معاشرہ کے ہر فرد کی ذمہ داری، اور خود اس کی اپنی حفاظت کا تقاضا ہے۔

(۰)

بہرحال، وہ ہے خدا کا قانون، اور یہ ہے ہمارے معاشرے کی حالت۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ابھی اس مہلت کے وقفہ سے گذر رہے ہیں جو تباہی سے پہلے آتا ہے۔ اگر ہم اب بھی سنبھل جائیں تو ہمارے بچاؤ کی صورت ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر ہم نے اس وقفہ سے فائدہ نہ اٹھایا اور اسی رفتار سے آگے بڑھتے گئے، تو پھر خدا کا اٹل قانون اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہے گا اور ہمارا حشر بھی انہیں قوموں جیسا ہو جائے گا جن کے متعلق کہا ہے کہ:-

وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ——— وہ قوم تباہ ہو گئی اور ہم نے کسی دوسری قوم کو اس کا وارث بنا دیا۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ ——— پھر ان کی تباہی پر نہ آسمان نے آنسو بہائے نہ زمین کی آنکھ نم آلود ہوئی۔

وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ۔ (۴۴ / ۲۸-۲۹) ——— اور نہ ہی انہیں اس کی مہلت دی گئی کہ اپنے بچاؤ کا سامان کر سکیں۔

اور اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہاں قرآنی معاشرہ قائم کیا جائے۔

(یہ مقالہ ۱۹۶۶ء میں لکھا گیا تھا آپ خود دیکھ لیجئے کہ اس دوران میں ہمارے حالات روبہ اصلاح ہو گئے ہیں یا خراب تر ہوتے چلے گئے ہیں؟)

* * *

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ یہ اس طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکر قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد -/۶۰ روپے
مکمل سیٹ مجلد -/۱۸۰ روپے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ مطلا جلدوں میں قیمت جلد اول تازہ ایڈیشن -/۷۵ روپے
جلد دوم، سوم، چہارم فی جلد -/۵۰ روپے

تبویب القرآن

(۱) آپ کے ذہن میں کوئی سوال آئے اور آپ معلوم کرنا چاہیں کہ اس کی بابت قرآنِ مجید نے کیا کہا ہے، اور کہاں کہاں کہا ہے، تو اس کتاب سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا۔

(۲) اس کتاب میں اس قسم کے قریب دو ہزار چار سو عنوانات ہیں، اور ہر عنوان کے تحت اُن آیات کا حوالہ دیا گیا ہے جن میں اس کے متعلق بالواسطہ یا بلاواسطہ قرآنِ مجید میں کچھ کہا گیا ہے۔ اِس سے آپ اس کتاب کی وسعت کا اندازہ لگا لیجئے۔ یہ مفکرِ قرآن کی قریب چالیس (۴۰) سال کی محنتِ شاقہ کا ماحصل ہے۔

(۳) کتاب بڑے سائز کے ۱۵۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ عمدہ سفید کاغذ، آفسٹ کی چھپائی، تین مضبوط اور دیدہ زیب جلدوں میں۔ تازہ ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے اسکی قیمت دو سو پچاس (۲۵۰) روپے اور محصول ڈاک پندرہ (۱۵) روپے ہے۔ چونکہ کتاب مکمل سیٹ ہی میں کارآمد ہو سکتی ہے اس لئے اسکی الگ الگ جلدیں مہیا نہیں کی جاتیں۔

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اُردو بازار لاہور۔ (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

ہم عید کیوں مناتے ہیں

پرویز

طلوع اسلام ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا، اور تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۸ء سے اب تک مسلسل اور متواتر پابندیٔ وقت کے ساتھ جاری ہے۔ قرآنی راہنمائی اور علم انسانی کی روشنی میں، زمانے کے تقاضوں اور حالاتِ حاضرہ کا جائزہ لینا اس کا مشن ہے۔ اس کی اشاعتوں کے انبار میں سے آپ کوئی سے دو پرچے اٹھا لیجئے، جہاں تک قرآنی فکر کا تعلق ہے، آپ کو ان میں کوئی تضاد، کوئی تخالف نہیں ملے گا۔ یہ اس لئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے اس کے (قرآن کے) منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی تضاد نہیں۔ کہیں اختلاف نہیں۔ اس لئے جو کچھ قرآنی راہنمائی میں کہا جائے گا اس میں بھی کوئی تضاد اور اختلاف نہیں ہوگا۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۸۴ء تک (کے چھتیس سال) کے عرصہ میں حالات بدلتے رہے لیکن طلوعِ اسلام نے جو کچھ قرآنی راہنمائی میں کہا، اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مرورِ زمانہ کا اس پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ رفتت کے کارواں کے غبار سے دُور دُور رہا۔ یہ وجہ ہے کہ کسی اہم واقعہ یا سوال کے متعلق ہم (عندالضرورت) طلوع اسلام کی کسی (جدید سے بعید تر) اشاعت کی کوئی تحریر شائع کرتے ہیں تو وہ "پرانی" نہیں ہوتی۔ ایسا نظر آتا ہے جیسے آج ہی لکھی گئی ہو۔ بلکہ، وقت کے گزرنے سے، وہ شرابِ کہن اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

عید کی تقریب پر (جو درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن کی تقریبِ سعید ہے) پرویز صاحب خصوصی درس بھی دیا کرتے ہیں، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ جو درس انہوں نے ۱۹۷۲ء میں دیا تھا، حالاتِ حاضرہ نے اس کی اہمیت میں اور بھی نکھار پیدا کر دیا ہے۔ اس لئے ہم اسے، قارئین کی خدمت میں، بطورِ تحفۂ عید پیش کرنے کی مسرت حاصل کرتے ہیں۔ (طلوعِ اسلام)

پرویز صاحب کا ۱۹۷۲ء کا خطابی درس۔

عزیزانِ من! اسلام و رحمت:

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، میرے آج کے خصوصی درس کا موضوع ہے "ہم عید کیوں مناتے ہیں" یہ موضوع بظاہر ایسا پیش پا افتادہ اور فرسودہ سا نظر آتا ہے کہ جب اس کا اعلان ہوا تو ایک صاحب سے نہ رہا گیا۔ وہ پوچھ ہی بیٹھے کہ اس موضوع کی اہمیت کیا ہے؟ کون نہیں جانتا کہ ہم عید کیوں مناتے ہیں؟ میں نے ان سے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے تو ذرا آپ ہی فرما دیجئے کہ ہم عید کیوں مناتے ہیں؟ انہوں نے جھٹ سے کہا کہ ہم عید اس لئے مناتے ہیں کہ...... کہ...... یہ عید ہے اسے منانا چاہیئے! کچھ توقف کے بعد انہوں نے کہا کہ یہ رمضان المبارک کے وداع ہونے کی خوشی میں عید منائی جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا ہے کہ جمعۃ الوداع کو مسجدوں میں رو رو کر کہا جاتا ہے۔ الوداع اے ماہِ رمضان، الوداع۔ خطبوں میں اس کی جدائی پر بین کئے جاتے ہیں۔ نوحے پڑھے جاتے ہیں۔ پکار پکار کر کہا جاتا ہے کہ[1]

تیری فرقت میں جلتے ہیں سینے کیسے گذریں گے "باراں" مہینے

ستم ظریفی کی انتہا

رمضان المبارک کے وداع ہونے کے تصور سے ہم اس قدر اشک فشاں اور نوحہ کناں ہوتے ہیں۔ لیکن جب وہ وداع ہو جاتا ہے تو ہم اس خوشی میں عید مناتے ہیں! کبھی آپ نے سوچا بھی ہے کہ ہم کیا کرتے ہیں؟ اور اگر کبھی رمضان المبارک کو ہماری نوحہ خوانی پر ترس آ جاتا ہے اور وہ ازراہِ ہمدردی اور دلجوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ اچھا میرے دوستو! میں آپ کی خاطر ایک دن اور رُک جاتا ہوں۔ میں ۲۹ کی بجائے ۳۰ کی شام کو چلا جاؤں گا تو ہمارے ہاں صفِ ماتم بچھ جاتی ہے۔ عید کی آمد کی پرجوش تیاریوں پر اوس سی پڑ جاتی ہے۔ ہم دیدے پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہیں کہ کہیں سے چاند دکھائی دے۔ ہم ٹمبکٹو تک تار بھیجتے ہیں کہ رمضان المبارک کے وداع ہو جانے کی خوشخبری مل جائے۔ اور جب ہر طرف سے مایوسی ہو جاتی ہے تو صبر شکر کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور اس کے بعد تیس کے چاند کی عید یوں مناتے ہیں جیسے کسی نے بیگار میں پکڑ رکھا ہو۔ کیا عزیزانِ من! کبھی آپ نے سوچا بھی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے اور ہم عید کیوں مناتے ہیں؟

خدا کا مقرر کردہ تیوہار

دنیا کی ہر قوم کوئی نہ کوئی تہوار مناتی ہے ہم بھی سال کے مختلف دنوں میں بعض تیوہار مناتے ہیں۔ لیکن اس عید کا تیوہار وہ ہے جسے بطورِ جشنِ مسرت منانے کا حکم خود خدا نے دیا ہے۔ اس سے آپ اس تیوہار کی اہمیت کا اندازہ لگا لیجئے۔ سورہ یونس میں ہے۔ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ

---

[1] واعظوں کی شاعری اسی قسم کی ہوتی ہے۔

مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۔ اے نوعِ انسان! تمہاری طرف تمہارے نشو و نما دینے والے کی جانب سے، ایک ضابطۂ قوانین نازل ہوا ہے جو انسان کے تمام نفسیاتی امراض کا علاج اپنے اندر رکھتا ہے۔ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۔ اور ان لوگوں کے لئے جو اس کی صداقتوں پر یقین رکھیں، سامانِ نشو و نما اور منزلِ انسانیت تک پہنچنے کی راہنمائی ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ ۔ اے رسول! ان سے کہہ دو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے ہے کہ ایسا عدیم النظیر ضابطۂ زندگی مل گیا ہے۔ تم کیا، اگر ساری دنیا کے انسان مل کر بھی کوشش کرتے تو اس جیسا ضابطہ نہ مل سکتا۔ لہٰذا، فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۔ تمہیں چاہیئے کہ ایسی متاعِ گراں بہا کے اس طرح بے مزد و معاوضہ مل جانے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ وہ متاعِ گراں بہا کہ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ (۱۰/۵۸) انسان جو کچھ بھی جمع کرے، یہ اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ متاعِ کائنات سے زیادہ گراں بہا سامانِ زیست سے زیادہ بیش قیمت!

یہ ہے، وہ تقریب جاں نواز جسے بطور جشنِ بہجت و مسرت منانے کی تاکید خدا نے کی ہے یعنی جشنِ نزولِ قرآن، اور نزولِ قرآن کی ابتدا چونکہ رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی۔ (شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ ۔ ۲/۱۸۵) اس لئے رمضان کا پورا مہینہ گویا اس جشن کی تیاریوں کے لئے تھا۔ اور عید الفطر اس جشن کی تکمیل کا دن

قرآن نے ہمیں کیا دیا ہے؟

یہاں، ایک اور اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بالآخر ہمیں دیا کیا ہے جس کے لئے ہم سے جشنِ مسرت منانے کی تاکید کی گئی ہے۔ مذہب کی دنیا سے اس سوال کا جواب عجیب ملتا ہے۔ (میں 'عزیزانِ من'! مذہب کی دنیا کہہ رہا ہوں۔ اسلام کی دنیا نہیں، قرآن کی دنیا نہیں، دین کی دنیا نہیں۔ انسانوں کے خودساختہ مذہب کی دنیا، جس میں قرآن کو عجیب و غریب معانی پہنا دیئے گئے ہیں) اربابِ مذہب سے پوچھئے کہ

مذہب کی دنیا کا جواب

انسان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے۔ تو وہ اس کے جواب میں جھٹ سے کہہ دیں گے کہ اس کا مقصد خود خالقِ کائنات نے بتا دیا ہے جب کہا کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱/۵۶) خدا نے جن و انس کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں۔ (میں اس آیۂ جلیلہ کا صحیح مفہوم ذرا آگے چل کر عرض کروں گا) اب ذرا سوچئے کہ اگر کوئی شخص (معاف فرمائیے) یہ سمجھے کہ اول تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں ہم سے پوچھے بغیر بھیج دیا، اور پھر کہا کہ ہم نے تمہیں اس لئے بھیجا ہے کہ تم ہماری عبادت کرو۔ نماز پڑھو، روزے رکھو۔ حج کرو۔

زکوٰۃ دو۔ مشقتیں اٹھاؤ۔ تکلیفیں برداشت کرو۔ یہ کرو۔ وہ نہ کرو۔ ساری عمر جانکاہ پابندیوں میں بسر کرو۔ ایسا کیوں کرو؟ اس لئے کہ ہم تمہارے آقا ہیں اور تم ہمارے غلام ہو۔ آقا غلام کو جو حکم دے اسے اسکی تعمیل کرنی ہوگی۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو تمہیں جہنم میں بھیجدیا جائے گا۔ یہ ٹھیک ہے۔ غلام کو اپنے آقا کا ہر حکم ماننا ہوگا۔ بالخصوص جب اس کی خلاف ورزی کی پاداش میں سامنے جہنم کا عذاب موجود ہو لیکن سوال یہ ہے کہ کیا، اس پر وہ غلام جشنِ مسرت منائے گا؟ خوشیوں کے شادیانے بجائیگا؟

یہ جواب وہ ہے جو ہمیں مذہب کی دنیا سے ملتا ہے لیکن آیئے، ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم کی بارگاہ سے ہمیں اس کا جواب کیا ملتا ہے، کہ وہی جواب درحقیقت خدا کا جواب ہوگا۔ قرآن کریم، خدا اور انسان کے تعلقات کا تصور کچھ اور دیتا ہے۔ وہ انسان کی تخلیق کا مقصد کچھ اور بتاتا ہے اور ان پابندیوں کا مقصود کچھ اور۔

قرآن کا جواب

قرآن خدا کی کتاب ہے۔ اس میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ کتاب تو یہ خدا کی ہے مگر اس میں ذکر خود تمہارا ہے۔ لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ کِتٰبًا فِیْہِ ذِکْرُکُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (۲۱/۱۰) یہ حقیقت ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب بھیجی ہے جس میں خود تمہارا ذکر ہے۔ کیا تم اس بلند حقیقت پر غور نہیں کرتے؟ عربی زبان میں لفظ ذکر کے ایک معنی تو وہی ہیں جو معنی ہم (اس لفظ کے) اردو زبان میں لیتے ہیں۔ انہی معانی کے پیشِ نظر علامہ اقبالؒ نے، اس حقیقت کو اس حسین انداز میں بیان کیا تھا کہ۔

محمدؐ بھی تیرا، جبریل بھی، قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرفِ شیریں، ترجماں تیرا ہے یا میرا؟

انسانی عظمت کا صحیفہ

قرآن، درحقیقت انسان کا ترجمان ہے۔ یہ ہے ذکر کا پہلا مفہوم لیکن اس لفظ کا ایک اور مفہوم بھی ہے۔ یعنی شرف و عظمت عزت و توقیر۔ اس مفہوم کے اعتبار سے اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کتاب میں خود تمہارے شرف و عظمت کا راز پوشیدہ ہے۔ یہ تمہیں عزت و توقیر اور احترام و تکریم کا مقام عطا کرنے کے لئے بھیجی گئی ہے۔ اسی لئے دوسرے مقام پر کہا کہ۔ بَلْ اَتَیْنٰھُمْ بِذِکْرِھِمْ فَھُمْ عَنْ ذِکْرِھِمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۳/۷۱) ہم انہیں شرف و مجد کا مقام عطا کرتے ہیں اور ان کی حماقت دیکھو کہ یہ اپنے ہی شرف و احترام سے اعراض برتتے ہیں۔ اس سے روگردانی کرتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ اِنَّہٗ کَانَ ظَلُوْمًا جَھُوْلًا (۳۳/۷۲) حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی ظالم اور جاہل واقع ہوا ہے۔ یہ بربنائے جہالت خود اپنے آپ پر ظلم کرتا ہے۔

قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ انسان کو الوہیاتی توانائی کا ایک شمہ دیا گیا ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) کہا جاتا ہے۔ اس میں اس قدر وسیع ممکنات

کی دنیا مضمر ہے کہ اس سے انسان زندگی کے بلند سے بلند ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی ذات کی یہ صلاحیتیں، غیر نشوونما یافتہ شکل میں دی گئی ہیں اور اِس دنیا کی زندگی اس کی نشوونما کا میدان ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن!
نہ سیرِ گُل کے لئے ہے نہ آشیاں کیلئے

انسان کے لئے جس قدر پابندیاں تجویز کی گئی ہیں وہ اس کی ذات کی نشوونما اور ثبات و استحکام کا ذریعہ ہیں۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (۲/۲۸۶)

یہ پابندیاں کیوں ہیں

خدا نے انسان پر جس قدر پابندیاں عائد کی ہیں وہ اس کی ذات میں وسعت پیدا کرنے کے لئے ہیں۔ ان سے خدا کوئی اپنا مقصد حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ خدا تمام کائنات سے مستغنی ہے۔ اسے اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے کسی سے کچھ کام لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ سب انسان کے فائدے کے لئے ہے۔ قرآن کا ضابطہ خود انسان کے شرف و مجد کے جوہروں کی نمود اور اس کی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لئے ہے۔ لہٰذا خدا اور انسان کا تعلق (معاذ اللہ) ایک مستبد آقا اور بیگار میں پکڑے ہوئے غلام کا نہیں، یہ ایک مشفق معلم اور طالب علم کا تعلق ہے جس میں استاد کی ہدایات، محنت کی تاکید اور بعض اوقات سرزنش، سطحی نگاہوں کو سختی نظر آتی ہے۔ لیکن درحقیقت وہ متعلم کی صلاحیتوں کی نمود و پرورش کے پروگرام کی کڑیاں ہوتی ہیں۔

لہٰذا، اگر ہم دو لفظوں میں سمجھنا چاہیں کہ قرآن کریم نے انسان کو کیا دیا ہے۔ اس کی تعلیم کا ماحصل کیا ہے۔ اس کا مقصود و منتہیٰ کیا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں اس نے کہا ہے کہ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ (۱۴/۱) اے رسولؐ! ہم نے یہ کتاب تیری طرف اس لئے نازل کی ہے کہ تو اس شمعِ نورانی کے ذریعے نوعِ انسان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے آئے۔ ذرا سوچئے کہ تاریکی میں کیا ہوتا ہے اور روشنی اس کی جگہ کیا کرتی ہے۔ تاریکی میں کسی شے کا صحیح مقام متعین نہیں ہوتا۔ روشنی میں ہر شے اپنی صحیح صحیح حقیقت کے ساتھ اپنے مقام پر نظر آجاتی ہے۔ یہ تاریکی ہی ہے جس میں ہم رسّی کو سانپ (اور سانپ کو بعض اوقات رسّی) سمجھ لیتے ہیں۔ روشنی آجانے سے رسّی، رسّی اور سانپ سانپ کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے انسان پر اس قدر تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں کہ نہ وہ خارجی کائنات کی کسی شے کو اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکتا تھا، نہ وہ اپنے مقام سے آگاہ تھا۔ یہ تاریکیاں کیا تھیں؟ قلب اور دماغ کی تاریکیاں۔ فکر و نظر کی تاریکیاں

یعنی جہالت اور توہم پرستی کی تاریکیاں۔ استبداد اور غلو عقیدت کی تاریکیاں۔ مختصراً یہ کہ اپنے مقام سے بیگانگی کی تاریکیاں

تاریکیوں میں گھِرا ہوا انسان

اور حقیقت یہ ہے کہ تمام تاریکیوں کا سرچشمہ اور منبع یہی تاریکی تھی، باقی سب تاریکیاں اسی کی پیداوار تھیں۔ اگر انسان پہ اس کا صحیح مقام روشن ہو جائے تو یہ تمام تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے انسان کا صحیح مقام کیا بتایا ہے؟ اگر ہم اس سوال کے جواب کی تفصیل میں جانا چاہیں تو اس کے لئے سارے سے کا سارا قرآن سامنے لانا پڑے گا۔ اس کے لئے بڑا وقت چاہیئے لہٰذا، میں اس تھوڑے سے وقت میں اس سوال کے صرف چند ایک گوشے آپ کے سامنے لاؤں گا

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

قرآن سے پہلے انسان کی حالت

لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ نزولِ قرآن سے پہلے، انسان کن تاریکیوں میں ڈوبا ہوا اور کن پستیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے مثنوی اسرار و رموز کے چند اشعار میں نہایت حسن و ایجاز سے بے نقاب کیا ہے، وہ کہتے ہیں

بود انساں در جہاں انساں پرست   ناکس و ناسودمند و زیر دست
سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش   بندہا در دست و پا و گردنش
کاہن و پاپا و سلطان و امیر   بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر
صاحبِ اورنگ و ہم پیرِ کنشت   باجے از کشتِ خراب او نوشت
در کلیسا اُسقف رضواں فروش   بہر ایں صیدِ زبوں دامے بدوش
برہمن گُل از خیابانش ببُرد   خرمنش مُغ زادہ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

یہ تھی انسان کی کیفیت نزولِ قرآن کے وقت۔ انسان، انسانوں کی پرستش کرتا تھا۔ ان کی غلامی کا جوا اس کی گردن میں پڑا تھا، کہیں ملوکیت کا آہنی پنجہ اس کی رگِ جان کو دبائے ہوئے تھا کہیں "روحانیت" کی غیر مرئی زنجیریں اس کے قلب و دماغ کو بُری طرح جکڑے ہوئے تھیں۔ کہیں سرمایہ پرست کی ہوسِ خون آشامی اس کے لہو کا آخری قطرہ تک چوس رہی تھی، غرضیکہ ہزار شکاری تھے اور یہ ان میں گھرا ہوا، مظلوم و مقہور، بیکس و بے بس نخچیر۔ یہ تھی انسان کی کیفیت جب قرآن آیا۔

زنجیر شکن انقلاب

قرآن آیا اور اس نے اعلان کیا کہ خدا کے اس عظیم داعیٔ انقلاب کے ظہورِ قدسی کا مقصد یہ ہے کہ وَ يَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ

وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْهِمْ (۷/۱۵۷) یہ ان زنجیروں کو توڑ دے گا جن میں انسان جکڑا ہوا چلا آ رہا ہے۔ یہ اس کے سر سے ان بوجھل سلوں کو اتار پھینکے گا جن کے بوجھ سے یہ پچلا جا رہا ہے۔ ان زنجیروں میں سب سے پہلی زنجیر اسکی توہم پرستی کی تھی جس کی رو سے یہ خارجی کائنات کی ہر قوت سے ڈرتا تھا۔ بادل گرجا اور یہ سہم گیا۔ بجلی کڑکی اور یہ دبک کر بیٹھ گیا۔ بارش شروع ہوئی تو یہ کپکپا اٹھا۔ پہاڑ سامنے آیا تو اس کی ہیبت سے لرز اٹھا۔ دریا میں موجیں اٹھیں تو اس کا کلیجہ بلیوں اچھلنے لگا۔ ان مہیب قوتوں کے خطرات سے بچنے کے لئے اس کے ذہن میں ایک ہی طریق آسکتا تھا۔ اور وہ یہ کہ ان قوتوں کو خدا تسلیم کر لیا جائے۔ ان کے سامنے جھکا جائے۔ ڈنڈوت بجا لایا جائے۔ ان کی پرستش کی جائے۔ ان کے حضور قربانیاں دے کر انہیں خوش کرنے کی کوشش کی جائے۔

تسخیر فطرت

خارجی قوتوں (مظاہر فطرت) کے مقابلہ میں یہ تھا وہ مقام جو انسان نے اپنے لئے تجویز کر رکھا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے اسے للکار کر کہا کہ تو ان سے ڈرتا ہے؟ حالانکہ کیفیت یہ ہے کہ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔ (۴۵/۱۳)۔ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اسے خدا نے تمہارے فائدے کے لئے قوانین کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ اگر تم ذرا غور و فکر سے کام لو تو یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ ان کا مقام کیا ہے اور تمہارا مقام کیا۔ یہ سب خادم ہیں اور انسان ان کا مخدوم۔ یہ سب ساجد ہیں اور انسان ان کا مسجود۔ یہ سب قوانین خداوندی کے تابع مجبور زندگی بسر کر رہی ہیں اور انسان کو ان قوانین کا علم دے دیا گیا ہے۔ وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا۔ (۲/۳۱) جوں جوں تم ان قوانین کا علم حاصل کرتے جاؤ گے۔ یہ قوتیں تمہارے سامنے جھکتی جائیں گی۔ یہ تھی وہ حقیقت جس کے پیشِ نظر، روحِ ارضی نے (اقبالؒ کے الفاظ میں) آدم کا یہ کہہ کر استقبال کیا تھا کہ،

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں   یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں،
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں   تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

یہ تھا وہ انقلاب آفریں پیغام جو قرآن نے انسان کو دیا اور اسے بتایا کہ۔

تو مردِ میداں، تو میرِ لشکر   نوری حضوری تیرے سپاہی

کائنات اور اس کی تمام قوتیں۔ ارض و سما اور ان کی سب نیرنگیاں۔ (لَكُمْ) تمہارے لئے ہیں تم ان کے لئے نہیں ہو۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

ہر بات قانون کے مطابق

اور پھر یہ بھی سمجھ لو کہ یہ قوانین جن کے مطابق یہ عظیم و مہیب قوتیں مصروفِ عمل ہیں، اٹل ہیں، غیر متبدل ہیں۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔ اس لئے تمہیں اس کا خدشہ نہیں ہونا چاہیئے کہ نہ معلوم کسی وقت یہ قانون بدل جائے اور یہ قوتیں میرے قابو سے نکل جائیں یہاں ہر بات قانون کے مطابق ہوتی ہے۔ قانون کے مطابق ہوتی رہے گی۔ اور ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں آئے گی۔ یہ جو آج، عزیزانِ من! زمین سے ابھر کر، چاند پر کمندیں ڈالی جا رہی ہیں اور مریخ کو زیرِ پا لانے کے منصوبے بن رہے ہیں، تو یہ کچھ اسی یقینِ محکم کے تابع ہو رہا ہے جسے قرآن نے آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے انسان کو یہ کہہ کر دلایا تھا کہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوگی، لہٰذا، تم نہایت اطمینان اور کامل اعتماد کے ساتھ ان مظاہرِ فطرت کو مسخر کرتے جاؤ

قرآن کا آئینہ

یہ تھا وہ آئینہ جس میں "قرآن نے، انسان کو اس کی حقیقی شکل دکھائی۔ اس حقیقت کو علامہ اقبالؒ نے اپنے مخصوص تمثیلی انداز میں، مثنوی اسرار و رموز کی ایک حکایت میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک شیر کا بچہ، پیدا ہونے کے ساتھ ہی کسی حادثے کی وجہ سے، ماں باپ سے الگ ہو کر، جنگل میں بھیڑوں کے گلے میں مل گیا۔ وہ وہیں بڑھا پھولا، شکل تو اس کی شیر کی سی رہی لیکن عادات و خصائل سب بھیڑوں کی پیدا ہوگئیں۔ ایک دن، ایک شیر نے بھیڑوں کے اس گلے پر حملہ کیا تو وہ کیا دیکھتا ہے کہ جہاں اس کی دہشت سے بھیڑیں بدحواس بھاگی جا رہی ہیں، ان میں ایک شیر بھی اسی طرح، ڈرے سہمے، جھاڑیوں کے نیچے چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ حیران تھا

بھیڑوں میں پلا ہوا شیر

کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ شیر، اور بھیڑوں کی طرح بزدل! تھوڑے سے توقف کے بعد، بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس نے بھیڑوں کا خیال چھوڑ دیا اور سیدھا اس "میش نما شیر" کی طرف لپک کر آیا۔ اسے جھاڑی میں جا دبوچا اور کان سے پکڑ کر اپنے ساتھ، ایک ایسے شفاف چشمے کے کنارے لے آیا جس میں اس کا عکس صاف دکھائی دے۔ اس نے اس شیر کو اپنے برابر کھڑا کیا اور اس کا سر جھکا کر اسے چشمے میں اس کا عکس دکھایا۔ شیر نے جب اپنا عکس دیکھا تو اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا اور ایک ہی ثانیہ میں بھیڑ سے شیر بن گیا۔

قرآن نے اپنے آئینے میں، انسان کو اس کا صحیح عکس دکھایا تو وہ ایک ہی جست میں، مسجودِ ملائک اور مخدومِ کائنات بن گیا۔

کہیئے، برادرانِ عزیز! کیا یہ واقعہ ایسا عظیم تھا یا نہیں کہ انسان اس پر جشنِ مسرت منائے؟

* * *

اب آگے بڑھیئے۔ انسان کیلئے مجبورِ محض اشیائے کائنات کو مسخر کر لینا پھر بھی آسان تھا۔

کسی کی محکومی نہیں

مشکل مرحلہ وہ تھا جہاں، انسان دوسرے انسان کے استبداد کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ زنجیر، انسانی حکمرانی کی تھی اور اس خوئے غلامی میں اسے اس قدر پختہ کر دیا گیا تھا کہ وہ انسانوں کی محکومیت کو اپنی فطرت کا تقاضا اور ان کا پیدائشی حق سمجھنے لگ گیا تھا۔ قرآن آیا اور اس نے یہ انقلاب آفریں اعلان کیا کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (۳/۷۹)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں۔ خواہ خدا نے اسے ضابطۂ کتاب، حکومت، حتیٰ کہ نبوت بھی کیوں نہ دی ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم خدا سے ورے، میری محکومی اختیار کرو۔ اسے بھی کہنا چاہیئے کہ تمہیں ربّانی بننا چاہیئے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم اس کتابِ خداوندی کی اطاعت کرو جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے رہتے ہو۔

آپ نے دیکھا کہ قرآنِ کریم کے اس ایک اعلان نے کس طرح، ہر قسم کی انسانی حکمرانی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا۔ اس نے انسان کو ہر قسم کی انسانی غلامی سے نجات دلا کر اسے ایک خدا کی محکومیت کی دعوت دی۔ اور وہ محکومیت بھی، قانون کی، جو خدا کی کتاب میں دیا گیا ہے اور جس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی ساری تعلیم، اسی بنیادی نقطہ کی شرح ہے کہ اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ (۷/۳) اطاعت صرف قوانینِ خداوندی کی کرو۔ ان کے علاوہ کسی انسان کی اطاعت مت کرو۔ اور یہی ہے وہ عظیم حقیقت جسے قرآنِ کریم کی اس آیت میں دہرایا گیا ہے۔ جسے میں نے سب سے پہلے پیش کیا تھا۔ یعنی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (۵۱/۵۶) انسان کا تخلیقی مقصد یہ ہے کہ وہ صرف قوانینِ خداوندی کی محکومیت اختیار کرے۔ اگر اس نے اس کے سوا کسی اور کی محکومی اختیار کر لی تو یہ اس کی تخلیق کے مقصد کے خلاف ہوگا۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے اس ایک اعلان سے کہ:

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی، باقی بتانِ آزری

انسان کو کس طرح اس ذلّت و پستی سے نکال کر، جو اسے اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے سامنے جھکنے سے ننگِ انسانیت بنا دیتی تھی، شرفِ آدمیت کے بلند ترین مقام پہ لا کھڑا کیا۔ ایک خدا کی اطاعت' اور وہ بھی قانون کی رُو سے، اس کے لئے کسطرح

دنیا بھر کی سرفرازیوں کا موجب بن گئی اور اسے یہ حقیقت سمجھا گئی کہ

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

* * *

مذہبی پیشوائیت کی محکومی

یہ تو تھا ملوکیت کا استبداد جو ایک انسان کو دوسرے انسان کے سامنے جھکنے پر مجبور کرتا ہے، لیکن یہ جھکنا انسان کے بدن کا تھا۔ وہ چاہتا تو اپنے قلب و دماغ کو اس سے آزاد رکھ سکتا تھا لیکن اس سے آگے انسان کے جھکنے کا وہ مقام آتا ہے جس میں اس کا قلب و دماغ محکومیت، اور بڑی شدید محکومیت کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ یہ محکومیت تھی مذہبی پیشوائیت کی، جو دوسرے انسانوں سے اپنی خدائی منواتی تھی۔ خواہ یہ "رضوانِ فروشی" شریعت کے علمبرداروں کی طرف سے ہو اور خواہ "جنت بداماں" طریقت کے مدعیوں کی طرف سے۔ قرآن نے، غلط عقیدت مندی کے عنکبوتی جالوں میں جکڑے ہوئے انسان کو آواز دی اور اس سے کہا کہ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ یہ جو مقدس نقابوں کی اوٹ میں خدا کے نمائندے بن کر تمہارے سامنے آتے ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ کَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّھْبَانِ لَیَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (۹/۳۴) پیرانِ طریقت ہوں یا علمائے شریعت، ان کا سارا مسئلہ معاشی ہے لیکن یہ اسے مذہب کے نقاب میں چھپائے رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کا یہ عالم ہے کہ خود کچھ نہیں کماتے اور دوسروں کی کمائی پر عیش کرتے ہیں۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ یہ لوگوں کو خدا کی راہ بتاتے ہیں لیکن درحقیقت انہیں خدا کے راستے پر چلنے سے روکتے ہیں۔ ان کا وجود اس کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہوتا ہے۔ یہ خدا سے ورے، خود خدا بن بیٹھے ہیں۔ (اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ) اس لئے خدا تک پہنچنے ہی نہیں دیتے۔ راستے ہی میں روک لیتے ہیں۔ یہ رہبر نہیں، رہزن ہیں۔ یہ اس لئے کہ اگر لوگ "خدا تک پہنچ جائیں" (یعنی اس کی کتاب کو اپنا راہنما بنا لیں) تو ان "خدا کے نمائندوں" کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ ان کی خدائی کی حقیقت تو اتنی ہے کہ،

ایں خدا "تا سجدہ اش کردی خدا است
چو بپائے اندر قیام آئی فنا ست

جب تک ان کے سامنے جھکے رہو، ان کی خدائی قائم رہے گی۔ جونہی اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ، یہ فنا ہو جائیں گے

* * *

زندہ بدست مردہ

مذہبی پیشوائیت کی حکمرانی کا دائرہ زندہ انسانوں تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ ان کی حکومت ان کے مرنے کے بعد بھی قائم رہتی ہے۔ بلکہ مرنے کے بعد ان کی گرہیں اور زیادہ مضبوط ہو جاتی ہیں۔ "روحانیت" کی دنیا میں، زندہ انسانوں پر مردے حکومت کرتے ہیں۔ یہاں مردہ بدست زندہ نہیں ہوتا۔ زندہ بدستِ مردہ ہوتا ہے۔ زندہ انسان، ان مُردوں کی بے پناہ قوتوں کے خیال سے کانپتا ہے، ڈرتا ہے۔ ان کے حضور منتیں مانتا اور نذرانے گذارتا ہے۔ اگر اس کے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی ایسا خیال گذر جائے جسے زیرِ زمین "حضرت صاحب" کی شانِ اقدس میں گستاخی پر محمول کیا جا سکے تو اس پر دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام ہو جاتی ہے۔ اور جب تک ان سے معافی مانگ کر، انہیں راضی نہیں کر لیتا (اور یہ معافی، ان کے مجاوروں کے حضور نذرانے گذارے بغیر نہیں مل سکتی) اس وقت تک وہ اطمینان کا سانس نہیں لیتا۔ یہ گذرے ہوئے احبار و رہبان، بزرگوں کے مزاروں کی شکل میں بھی زندہ و پائندہ ہوتے ہیں، اور ائمہ سلف کے اقوال و افعال کی صورت میں بھی ہر وقت اعصاب پر سوار۔ ان دونوں کی غلامی کا قلادہ، زندہ انسانوں کی گردن میں پڑا رہتا ہے (اس سے "تقلید" کے معنی آپ کی سمجھ میں آ جائیں گے۔ قلادہ اُس پٹے یا رسّے کو کہتے ہیں جو جانور کے گلے میں ڈال دیا جاتا ہے تا کہ اس کا مالک جدھر بھی چاہے اُسے، اس سے پکڑ کر کھینچتا پھرے اور وہ خاموش گردن جھکائے اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہے)۔ ان کی "ہمہ وقت موجودگی" کا یہ عالم ہے کہ خدا کی کتاب کا ارشاد کچھ ہو، آپ کی عقل و بصیرت کچھ کہے۔ جونہی آپ نے ان کی کسی بات کے خلاف کچھ کہا، ان میں سے کوئی نہ کوئی متوفی آپ کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اب آپ آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔

یہ تھی غلامی کی وہ شدید ترین شکل جس میں انسانیت جکڑے چلی آ رہی تھی۔ قرآنِ کریم نے ایک انقلابی آواز سے، غلامی کی ان زنجیروں کو تارِ عنکبوت کی طرح جھٹک کر الگ کر دیا۔ اس نے کہا کہ ان کے گذرے ہوئے اسلاف کی پوزیشن اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے اپنے وقت پر دنیا سے چلے گئے لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ۔ جو کچھ انہوں نے کیا اس کی ذمہ داری ان پر ہے اور وہی اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ جو کچھ تم کرو گے اس کی ذمہ داری تم پر عائد ہوگی۔ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۳۴) تم سے یہ پوچھا ہی نہیں جائے گا کہ انہوں نے کس قسم کے کام کئے تھے۔ ان میں جو لوگ صاحبِ ایمان تھے، ان کے متعلق بھی زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہو کہ إِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ (۵۹/۱۰) وہ ہمارے بھائی تھے جو ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نہ ان کا کوئی قول تمہارے لئے

سند ہو سکتا ہے نہ ان کا کوئی عمل تمہارے لئے حجت۔ سند اور حجت خدا کی کتاب ہے اور بس۔ اسلاف پرستی سے انسان کا ماضی تو روشن ہوتا ہے لیکن مستقبل تاریک۔

گدی میں آنکھیں

اس نکتہ کی وضاحت کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اہلِ جہنم کے منہ پیچھے کی طرف مڑے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں پیشانی کے بجائے ان کی گدی میں لگی ہوں گی۔ (یَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِی النَّارِ) اس کی وجہ یہ کہ (خود ان کے الفاظ ہیں) وَقَالُوْا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (۳۳/۶۷) "ہم نے اپنے بڑے بزرگوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں غلط راستے پر ڈال دیا"۔ انہی کے متعلق قرآن دوسری جگہ (سورۂ یٰسین میں) کہتا ہے کہ ان کی گردنوں میں اس قسم کے طوق پڑ جاتے ہیں جن سے وہ راستہ دیکھنے کے قابل نہیں رہتے۔ ان کی نگہ بصیرت سلب ہو جاتی ہے۔ ان کے آگے اور پیچھے اندھی عقیدت اور توہم پرستی کی دیواریں کھڑی ہو جاتی ہیں جن کی وجہ سے انہیں کچھ نظر ہی نہیں آتا (۳۶/۹)

بھیڑوں کا گلہ

سورۂ بقرہ میں قرآن نے مقلدین کو بھیڑوں کے گلے اور ان کے مقتداؤں کو گڈریئے سے تشبیہ دی ہے۔ اور کہا ہے کہ گڈریا کچھ آوازیں نکالتا ہے، بے الفاظ اور کچھ الفاظ بولتا ہے، بے معنی۔ اور یہ بھیڑیں ان آوازوں پر اس طرح لگی ہوتی ہیں کہ یہ سر جھکائے ان کے مطابق اِدھر اُدھر چلتی رہتی ہیں۔ نہ گڈریئے کو معلوم ہوتا ہے کہ ان آوازوں کا مطلب کیا ہے اور ان الفاظ کا مفہوم کیا۔ اور نہ ہی ان بھیڑوں کو اس سے کچھ واسطہ۔ گڈریئے نے یہ آوازیں اور الفاظ اپنے بڑوں سے اسی طرح سن کر یاد کر رکھے ہوتے ہیں۔ اور بھیڑیں ان کے مطابق، اپنی عادتِ مستمرہ کی رُو سے، غیر شعوری طور پر ان کا اتباع کئے چلی جاتی ہیں۔ (۲/۱۷۰-۱۷۱)

قفس کا پرندہ

اس قسم کی ذہنی غلامی سے انسان کی کیفیت کیا ہو جاتی ہے۔ اس کا اندازہ لگانا ہو تو کسی صبح، جناح باغ میں جا بیٹھئے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک تیتر والا خالی پنجرہ لئے آگے آگے جا رہا ہے، اور تیتر، اس کے پیچھے پیچھے بھاگتا چلا آ رہا ہے۔ آزاد پرندے اسے آوازیں دیتے ہیں کہ تمہارا مقام اس طرف ہے۔ اُدھر کہاں جا رہے ہو۔ وہ ان آوازوں کو سنتا ہے۔ اور بال و پر رکھنے کے باوجود، اور تیزی سے قفس کی طرف لپکتا ہے۔ اگر اس کا دروازہ بند پاتا ہے تو اسے چونچ مار مار کر کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب تک پنجرے کے اندر بند نہیں ہو جاتا اسے چین نہیں پڑتا۔ آزاد فضاؤں میں اڑنے والے مرغانِ سحر جب اس کی اس حرکت پر طعنہ زن ہوتے ہیں تو وہ نہایت سکون و اطمینان سے انہیں

کہتا ہے کہ تم قفس کی زندگی کی لذتوں کو کیا جانو۔

نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

تقلید کی زندگی بڑی سہل انگاری اور تن آسانی کی ہوتی ہے۔ اس میں نہ کسی قسم کی علمی کاوش کرنی پڑتی ہے، نہ فکری کاہش۔ جو ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس پر آنکھیں بند کر کے چلتے جاؤ اور یہ وظیفہ پڑھتے رہو کہ "کل خیرٍ فی اتباع من السلف" ہر قسم کی نیکیاں اور بھلائیاں سلف کے اتباع میں ہیں۔ اس سے جھوٹا اطمینان تو ضرور میسّر آ جاتا ہے لیکن انسان اپنے مقام سے گر کر حیوانات کی سطح پر آ جاتا ہے۔ وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے اسلاف پرستی کی غلامی سے یہ کہہ کر نجات دلائی کہ وہ اپنے وقت پر دنیا سے چلے گئے۔ تم سے ان کی بابت کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔ تم سے یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر کتاب اللہ کی روشنی میں اپنے لئے کیا فیصلے کئے تھے۔

مُردوں کی حالت

یہ تو رہا سلف کا معاملہ۔ جہاں تک مُردوں کی غلامی کا تعلق ہے اس نے زندہ انسانوں سے کہا کہ ذرا سوچو کہ جن ہستیوں کو تم اپنا "خدا" سمجھ رہے ہو، ان کی کیفیت یہ ہے کہ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار کو سُن نہیں سکتے۔ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ (۳۵/۱۴) اور اگر وہ بفرضِ محال تمہاری پکار سن بھی لیں تو اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ ان کے عدمِ شعور کی تو یہ کیفیت ہے کہ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ (۱۶/۲۱) انہیں خود اپنے متعلق بھی علم نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔ لہٰذا ان سے ڈرنا کیوں اور ان سے مرادیں کیوں مانگنا۔ یہ شرفِ انسانیت کی تذلیل ہے کہ زندہ انسان مُردوں سے ڈرتا رہے اور انہیں اپنا حاجت روا تسلیم کرے۔

غور کیجئے کہ قرآن نے اس انقلابی اعلان سے انسان کو کس کس نوعیت کی ذلتوں سے بچا لیا ہے؟ سوچئے کہ کیا ایسا انقلاب اس قابل نہیں کہ اس پر انسان جشنِ مسرت منائے؟

* * *

روٹی کی محتاجی

انسان کو انسان کے سامنے جھکانے کا ایک اور مؤثر حربہ یہ تھا کہ اسے روٹی کا محتاج بنا دیا جائے اور اس طرح اسے بھوکا رکھ کر اس سے اپنا ہر حکم منوا لیا جائے۔ آپ نے سرکس کے شیر کو دیکھا ہوگا۔ اس میں اتنی قوت ہوتی ہے کہ ایک رنگ ماسٹر تو کیا، وہ پنجرے کے اندر کے تمام آدمیوں کو چبا سکتا ہے۔ لیکن آپ نے دیکھا کہ وہ، اس کے باوجود، رنگ ماسٹر کے ہنٹر کے سامنے، کس طرح چھتا

اور دھاڑنا ہر وہ حرکت کرتا ہے جس کا اسے اشارہ کیا جاتا ہے؟ یہ کیوں؟ محض بھوک کی وجہ سے۔ یہی حربہ صاحبِ قوت انسانوں نے، دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنانے کے لئے اختیار کیا۔ انہوں نے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیا اور اس طرح دوسروں کو محتاج بنا کر، ان سے اپنا ہر حکم منوانے لگے۔ اس طرح انسان، شرفِ آدمیت سے عاری ہو کر، مجبور کیے حیوانات کی سطح پر آ پہنچا۔

قرآن آیا اور اس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا کہ رزق کے معاملہ میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج نہیں۔ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَ اِيَّاهُمْ۔ (۶/۱۵۲) ہم تمام افراد کے رزق کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے بھی اور انکی اولاد کے بھی۔ ہم ایسا نظامِ معاشرہ قائم کرنے کی ہدایت کرتے ہیں جس میں رزق کے سرچشمے انسانوں کی ملکیت میں رہنے کے بجائے، تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کا ذریعہ بنیں، اور کوئی کسی کا محتاج و محکوم نہ ہو۔ غور فرمائیے کہ اس اعلان سے، انسان کو کس قدر جانگسل ذلت اور روح فرسا محکومیت سے نجات مل گئی۔ سوچئے برادرانِ گرامی! کہ تاریخِ انسانیت کا کیا یہ ایسا انقلاب نہیں جس پر نوعِ انسان، مسرت کے جشن منائے!

⁂

یہ تھی، عزیزانِ من! نزولِ قرآن سے پہلے انسانوں کی حالت۔ وہ حالت جس میں ہر انسان، اپنے سے زیادہ قوت یا عقلِ فریب کار رکھنے والے انسان کے سامنے جھکتا تھا۔ اور انسان کا انسان کے سامنے جھکنا، شرفِ انسانیت کی انتہائی ذلت ہے۔ اس لئے کہ،

تو جُھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من

فیصلہ کن حقیقت

اس سے تو انسان کا کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ قرآن نے، انسانوں کے سامنے جھکنے اور جھکانے کے تمام دروازے بند کر دیئے۔ یہ تھے وہ تصورات جو قرآن نے دیئے اور اس طرح انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کیا اور اس سے کہہ دیا کہ اگر تم ان دروازوں کو بند رکھو گے تو تمہیں ایسا معاشرہ میسر آ جائے گا جس میں کیفیت یہ ہو گی کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ جس میں تمہیں نہ کسی قسم کا خطرہ ہو گا نہ خوف و حزن۔ ہر طرح کا اطمینان اور ہر قسم کی سلامتی۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ کوئی شاعری نہیں۔ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّ مَا هُوَ بِالْهَزْلِ (۸۶/۱۴) یہ ایک فیصلہ کن حقیقت ہے۔ یونہی ہوا در ہوا بات نہیں۔ اس کے بعد کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہم نے یہ زنجیریں کیوں توڑی ہیں، تمہارے سامنے میں حائل پتھروں کو کیوں ہٹایا ہے، یہ سامنے کے پھاٹک کیوں کھول دیئے ہیں۔ اس لئے کہ ہر انسانی بچے کو زندگی کی دوڑ میں مسابقت کے لئے ایک جیسا میدان ملے۔ نہ کسی کو بے جا رعایت

ملے۔ کسی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ۔ جس کا جی چاہے اپنی محنت سے آگے بڑھ جائے۔ جس کا جی چاہے فقدانِ عمل سے پیچھے رہ جائے۔ یہاں ہر فیصلہ انسان کے جوہرِ ذاتی اور عملِ پیہم کے مطابق ہو۔ كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ (۷۴/۳۸-۳۷) یہ نہ ہو کہ بڑے باپ کا بیٹا، پیدا ہوتے ہی سونے کا چمچہ منہ میں لئے ہو اور غریب کا بیٹا ابتدائی تعلیم تک بھی حاصل نہ کر سکے کیونکہ اس کے باپ کے پاس اسے سکول میں داخل کرانے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ یہ پیدائشی تفریق، برہمن کی خودساختہ زنجیریں تھیں جن میں وہ شودر کے بچوں کو جکڑے رکھتا تھا۔ قرآن نے انسان کو ان تمام زنجیروں سے آزاد کر دیا۔ قرآن کیا ہے؟ مژدہ کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے۔

یہ تھا برادرانِ عزیز! وہ مقصدِ جمیل و جلیل جس کے لئے نوعِ انسان کو قرآن دیا گیا تھا۔ اور اس سے کہا گیا تھا کہ اپنے منشورِ حریت و آزادی کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ یعنی انسان کو یہ بتانے کے لئے کہ،

نہ ستارہ سے آگے مقام ہے تیرا

بلکہ ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا۔ انسان اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سے بھی آگے جا سکتا ہے بشرطیکہ اسے وہ قوت حاصل ہو جائے جو وحی کی راہنمائی عطا کرتی ہے (۵۵/۳۳)

قرآن نے کیا کیا

یہ تھا، مقصد قرآن کی تعلیم کا۔ اس نے ایک ایسا آئینہ دیا جس میں انسان کو، اس کے صحیح خد و خال نکھر کر نظر آ سکتے تھے۔ نبی اکرمؐ نے، اس شیرِ بیشہ کی طرح، ساتھ کھڑے ہو کر، انسان کو، قرآن کے آئینے میں اس کی اصلی شکل سے روشناس کرایا اور اس طرح مردانِ خود آگاہ کی ایک جماعت وجود میں آ گئی۔ اس جماعت نے ایک طرف قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ کر، مظلوم انسانیت کو استبدادِ ملوکیت سے نجات دلائی، تو دوسری طرف، ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی کر کے مذہبی پیشوائیت کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔ اس نے یہودیوں کو خارج البلد کر کے، سرمایہ پرستی کی بساط لپیٹ دی اور شام کی خانقاہوں میں علم و بصیرت کے دیئے جلا کر، انسان کے قلب و نظر کی تاریکیوں کو روشنی سے بدل دیا۔ اس طرح اس جماعت کی حق آگاہی اور خودشناسی نے انسان کو وہ مقام عطا کر دیا جس کے حصول کے لئے اسے پیدا کیا گیا تھا۔ لیکن — اور یہ لیکن کرب و درد کی ایک — دنیائے پرسوز اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ اس لیکن کو برادرانِ عزیز! میرے الفاظ میں نہیں، خود قرآن کے الفاظ میں سنیئے۔ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا۔ انہیں اس شخص کی عبرت انگیز داستان سناؤ جسے ہم نے اپنے قوانین عطا کئے تھے کہ وہ ان کی روشنی میں مقامِ انسانیت حاصل کرے۔ اس نے ایسا کیا لیکن اس کے بعد فَانْسَلَخَ مِنْهَا۔ وہ انہیں یوں چھوڑ گیا جیسے سانپ کینچلی اتار کر آگے نکل جاتا ہے اور اس پر

اس کا نشان تک باقی نہیں رہتا۔ فَاَتۡبَعَهُ الشَّيۡطٰنُ فَكَانَ مِنَ الۡغٰوِيۡنَ۔ شیطان تو اس کی گھات میں پہلے سے بیٹھا تھا۔ اس نے اسے جا دبوچا اور دوسرے راستے پر ڈال دیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ وَلَوۡ شِئۡنَا لَرَفَعۡنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗۤ اَخۡلَدَ اِلَى الۡاَرۡضِ وَاتَّبَعَ هَوٰٮهُ ہم چاہتے تھے کہ اس قرآن کے ذریعے اسے آسمان کی بلندیوں پر لے جائیں لیکن یہ بدنصیب زمین کی پستیوں کے ساتھ چمٹ کر رہ گیا اور زندگی کے بلند مقاصد کی جگہ اپنی خواہشات ہی کے پیچھے لگ گیا۔ اس ہوس پرستی سے اس کی حالت یہ ہوگئی کہ ہر وقت کتے کی طرح زبان لٹکائے پھر رہا ہے ذٰلِكَ مَثَلُ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا۔ یہ حالت ہو جاتی ہے اس قوم کی جو ہمارے قوانین کی تکذیب کرتی ہے۔ یعنی وہ ان کا زبان سے انکار نہیں کرتی۔ دعویٰ کرتی رہتی ہے کہ اس کا ان قوانین پر ایمان ہے۔ لیکن عملاً ان کی تکذیب کرتی ہے۔ یہ ہے قرآن کے الفاظ میں ہماری دردانگیز اور عبرت آمیز داستان! اس کے بعد کہا۔ فَاقۡصُصِ الۡقَصَصَ لَعَلَّهُمۡ يَتَفَكَّرُوۡنَ (۷/۱۷۶) انہیں ان کی داستان سناؤ شاید اسی سے ان میں غور و فکر کی صلاحیت بیدار ہو جائے اور یہ سوچیں کہ ہم کس آسمان کے ٹوٹے ہوئے تارے ہیں، ہم کیا تھے، اور اب کیا بن کر رہ گئے ہیں!

یہ کیسے ہوا

یہ کیسے ہوا؟ اس کا جواب خود اس آیت میں موجود ہے۔ اس قوم نے قوانینِ خداوندی کو اس طرح چھوڑا کہ ان کا کوئی نشان تک ان کی زندگی میں باقی نہ رہا۔ اور یہی وہ شکایت ہے جو حضور نبی اکرمؐ بجناب باری تعالیٰ ان الفاظ میں کریں گے کہ وَقَالَ الرَّسُوۡلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِى اتَّخَذُوۡا هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَهۡجُوۡرًا (۲۵/۳۰) "اے میرے رب! یہ ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا" قرآن کو چھوڑا تو دین مذہب میں تبدیل ہوگیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ اسے علامہ اقبالؒ نے بڑے لطیف اور حسین طنز کے ساتھ بیان کیا ہے۔ وہ مذہب کے علمبردار مُلّا کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ،

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

تیرا دعویٰ ہے کہ تو خدا تک پہنچا ہوا ہے۔ اس کا تو مجھے علم نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ تو مقامِ آدمیت سے قطعی ناآشنا ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ،

بآدمے نہ رسیدی خدا چہ می جوئی!

جو مقامِ آدم سے ناآشنا ہے وہ خداشناس کیسے ہو سکتا ہے؟ جو اپنے مقام سے واقف نہیں وہ خدا کے مقام سے کیسے واقف ہو سکتا ہے؟ جو اپنے تصورات کے تراشیدہ بتوں کے سامنے جھکتا ہے جو اپنے توہمات کے پیدا کردہ خداؤں کے سامنے جھکتا ہے جو اپنے جیسے انسانوں کی حکمرانی کو تسلیم کر لیتا ہے۔ وہ خدا تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟

کہا جائے گا کہ ہم تو مختلف نوعیتوں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یورپ کی قوموں نے کائنات کی قوتوں کو مسخر کر لیا ہے۔ وہ تو آزادی کی نعمت سے سرفراز ہیں

مغرب کا انسان

لیکن یہ خیال انتہائی سطح بینی پہ مبنی ہے۔ انسان کی آزادی اور غلامی ماپنے کا معیار خارجی قوتوں پر کنٹرول نہیں۔ اس کا معیار وہ فلسفہ زندگی یا تصورِ حیات ہے جسے کسی قوم نے اختیار کر رکھا ہو۔ آپ کو معلوم ہے کہ یورپ کے محققین نے انسان کے متعلق جو نظریات پیش کئے ہیں ان کی رُو سے اس کی پوزیشن کیا سامنے آتی ہے ایک ایسی مجبور و مقہور مخلوق جسے اپنے کسی عمل اور ارادہ پہ کوئی اختیار نہیں۔ (مثلاً)

(۱) ان کے علمائے علم الحیات (BIOLOGISTS) کی تحقیق نے یہ بتایا ہے کہ انسانی بچہ اپنی سیرت و کردار کے تمام بنیادی خطوط اپنے باپ کے نطفہ سے متوارث لیتا ہے اور انہیں مٹانے پہ اس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لہٰذا انسان پیدائش کے اعتبار سے مجبور ہے

(۲) محققین علم الانسان (ANTHROPOLOGISTS) آگے بڑھے اور دنیا کو یہ بتایا کہ عہدِ قدیم سے لیکر اس وقت تک، انسان کی سینکڑوں نسلوں میں جو عقائد، تصورات رسوم و مناسک متوارث چلے آ رہے ہیں ہر انسانی بچہ ان کا مرکب ہوتا ہے اور اسے اس کی قدرت ہی حاصل نہیں ہوتی کہ ان اثرات کو محو کر سکے۔

(۳) علمائے عمرانیات (SOCIOLOGISTS) آگے اور انہوں نے اعلان کیا کہ انسانی بچہ جس ماحول میں سانس لیتا ہے اس کا کریکٹر اس کے گہرے اور انمٹ نقوش کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسان اپنے ابتدائی ماحول کی زنجیروں سے آزاد ہو نہیں سکتا۔

(۴) علمائے نفسیات (PSYCHOLOGISTS) نے مسکرا کر کہا کہ صاحب! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں جس چیز کو آپ انسان کا اختیار و ارادہ اور فکر و شعور بتا رہے ہیں، وہ کوئی شے ہی نہیں۔ انسان کی ہر فکر اور ارادہ کو ایک اور ہی قوت کنٹرول کر رہی ہے جسے اس کا نفسِ لاشعور (UN-CONSCIOUS/MIND) کہا جاتا ہے یہ وہ جن ہے جو کسی کے قابو میں ہی نہیں آ سکتا۔ نہ اس کے بدلنے میں کسی کا اختیار ہے، نہ اس کی خلاف ورزی کا کسی میں یارا۔ انسان کا ہر عمل اور ارادہ اس کے نفسِ لاشعور کی نمود کا نام ہے لہٰذا جسے آپ انسان کا باختیار شعور سمجھتے ہیں وہ فریبِ تخیل کے سوا کچھ نہیں۔

(۵) علمائے اقتصادیات (ELONOMISTS) آگے اور انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان اپنے زمانے کے معاشی نظام کی پیداوار ہوتا ہے۔ جس قسم کا یہ نظام اسی قسم کا اس دور کا انسان۔ جب پوچھا گیا کہ یہ معاشی نظام کس کا قائم کردہ ہوتا ہے تو جواب ملا کہ یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کا پیدا کردہ ہوتا ہے جس کے بدلنے

پر انسان قطعاً قادر نہیں ۔

آپ سوچئے، عزیزانِ من ! کہ انسان کے متعلق جو تصور ان مفکرین و محققین کا پیش کردہ ہے اس کی رُو سے انسان کو ذرا سا بھی آزاد قرار دیا جا سکتا ہے ؟ تو اسے فطرت کی بالادستی یا غیر قوموں کی محکومی تو پھر بھی ایسی غلامی ہے جس کی زنجیریں توڑنے کی خواہش ہر انسان کے دل میں موجزن رہتی ہے لیکن جب انسان اپنے متعلق خود اس قسم کا تصور اپنے ذہن میں راسخ کر لے تو وہ ان زنجیروں سے کبھی بھی رستگاری حاصل کر سکتا ہے ؟ لہٰذا، ایشیا ہو یا یورپ، افریقہ ہو یا امریکہ، آج حقیقی آزادی کہیں بھی دکھائی نہیں دیتی۔...

سب اپنے بنائے ہوئے زنداں میں ہیں محبوس
مشرق کے ثوابت ہوں کہ مغرب کے ہوں سیّار

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری۔ اس غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لئے آج دنیا کے ہر انسان کو قرآن یہ پیغام دیتا ہے کہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْٓ اُوْحِیَ اِلَیْکَ اِنَّکَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔ اس قرآن کے ساتھ پھر سے متمسک

اب بھی کچھ نہیں بگڑا

ہو جاؤ یہ تمہیں زندگی کے اس راستے پر ڈال دے گا جو سیدھا منزلِ انسانیت تک پہنچتا ہے۔ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ اس سے تمہیں پھر وہی شرف و مجد حاصل ہو جائے گا جو ایک دفعہ حاصل ہوا تھا۔ وَسَوْفَ تُسْـَٔلُوْنَ (۴۳/۴۴) خدا کا قانونِ مکافات بہت جلد تم سے پوچھ لے گا کہ تم نے ایسا کیا تھا یا نہیں یعنی اس کے نتائج مرتب ہونے میں کچھ دیر نہیں لگے گی۔ یہ تو ایسا شجرِ طیّب ہے کہ تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍ (۱۴/۲۵) جو ہر زمانے میں اپنا پھل بدستور دیئے چلا جاتا ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں محتاج
بہار ہو کہ خزاں ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

دیر تو تمہاری طرف سے ہی ہے۔ اس کی شاخیں تمہاری طرف جھکی ہوئی ہیں۔ ذرا ہاتھ بڑھاؤ اور پھل تمہاری جھولی میں ہوگا۔ قرآن میں ہر وقت اس کی صلاحیت موجود ہے کہ یہ انسان کو اس کا صحیح مقام عطا کر دے۔

گر زمینی آسماں سازد ترا آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا
خستہ باشی استوارت می کند پختہ مثلِ کوہسارت می کند
نوعِ انساں را پیامِ آخریں حاملِ اُو رحمۃ للعالمین

اگر تو زمین کی پستیوں تک میں گر چکا ہے تو یہ (قرآن) تجھے آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دے گا۔ المختصر یہ تمہیں اس قسم کا انسان بنا دے گا جس قسم کا

انسان، خدا کی مشیت چاہتی تھی۔ یعنی جس قسم کا انسان خدا بنانا چاہتا تھا، یہ تمہیں اسی قسم کا انسان بنا دے گا۔
تو کمزور ہے تو یہ تجھے پہاڑ کی طرح محکم اور پائیدار بنا دے گا، یہ قرآن، کسی ایک قوم، کسی ایک ملک کے لئے نہیں۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے اور قیامت تک غیر متبدل۔ یہ خدا کی آخری کتاب ہے اور اس کا لانے والا (صلعم) تمام اقوامِ عالم کے لئے باعثِ رحمت۔

* * *

یہ تھا جو پرویز صاحب نے ۱۹۷۰ء میں لکھا تھا۔ اس کے بعد اس بارہ سال کے عرصہ میں قرآنی معیار کے مطابق ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ جب گاڑی غلط پٹڑی پر پڑ جائے تو وہ جس قدر تیز چلے گی منزل سے دور ہوتی جائیگی۔ انسانی غلامی اور محکومی کی جن زنجیروں کو قرآن نے توڑا تھا، ہم نے ان کے ایک ایک ٹکڑے کو مژگانِ عقیدت اور گیسوئے ارادت سے اکٹھا کر کے، اسطرح زیبِ تن کیا کہ ہمارا بال بال ان میں جکڑا گیا اور حالت یہ ہو گئی کہ:

نہ دام دانم و نے دانہ، ایں قدر دانم
ز فرق تا بقدم ہر چہ ہست دربند است

فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ - (۷/۱۷۶)

یہ ہو جاتی ہے حالت اس قوم کی ۔ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا - جو ہمارے قوانین کا زبان سے اقرار کرے لیکن عملاً اس کی تکذیب کرے۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کہا ہے:-

فَاقْصُصِ الْقَصَصَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (۷/۱۷۶)

انہیں ان کی عبرت انگیز داستان سناؤ تاکہ یہ غور و فکر کے بعد سوچیں کہ:

ہیں آج کیوں ذلیل! کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

* * *

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

(۱) بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلا وجہ تاخیر نہ ہو۔
(۲) پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہِ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں، اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائیگا
(۳) جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

اسلامی مملکت سے متعلق مزید سوالات

(تدوینِ قوانین یا حصولِ اقتدار؟)

طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جون ۱۹۸۴ء میں، اسلامی مملکت سے متعلق سوالات کے جو جواب لکھے گئے، قارئین کی طرف سے ان کا ردِ عمل بڑا خوشگوار اور طمانیت بخش تھا۔ عام تاثر یہ تھا کہ اگرچہ ان موضوعات پر ایک عرصہ سے طلوعِ اسلام میں مفصل مقالات اور خطابات شائع ہوتے رہے ہیں، لیکن ان جوابات کا اسلوبِ بیان مختصر ہونے کے ساتھ بڑا مؤثر تھا۔ کہا یہ گیا ہے کہ حتی الامکان اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے۔ ان حضرات کی خواہش کے مطابق، اس کے لئے اشاعتِ رواں میں کچھ گنجائش نکال لی گئی ہے۔

سب سے پہلا اور اہم سوال یہ ہے کہ:

> تشکیلِ پاکستان سے لے کر اس وقت تک، اس حقیقت کو ہر ایک نے تسلیم کیا ہے کہ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا۔ یہ ایک نظری مملکت ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان لوگوں کو چھوڑیئے جن کے متعلق کہا (یا سمجھا) جاتا ہے کہ انہیں مذہب سے دلچسپی نہیں۔ جن حضرات کا اوڑھنا بچھونا ہی مذہب ہے، انہوں نے اسلامی قوانین کی تدوین کے سلسلے میں کیا کیا ہے؟ اگر ان کی سعی و کاوش کا سلسلہ وار تذکرہ سامنے آ جائے تو اس حقیقت کے سمجھنے میں آسانی ہو جائے کہ اسلامی قوانین آج تک کیوں مدوّن نہیں ہو سکے؟

جواب: ہماری مشکل یہ ہے کہ جسطرح تحریکِ پاکستان سے متعلق کوئی مستند اور قابلِ اعتماد تاریخ مرتب نہیں ہوئی اس لئے جو کچھ کسی کے جی میں آئے کہہ دیتا ہے۔ اسی طرح ایسی کوئی تاریخ بھی مرتب نہیں ہوئی۔ جس میں یہ بتایا گیا ہو کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد یہاں مذہب کے نام پر کیا کیا کھیل کھیلے گئے اور ان میں کس نے کیا رول ادا کیا۔ آنے والا مؤرخ اگر اس موضوع کے متعلق تحقیق کرنا چاہے گا تو اسے طلوعِ اسلام کے فائلوں میں کافی مواد مل جائیگا۔ ہم سرِ دست چند ارشادات پر اکتفا کریں گے۔

یوں تو پاکستان کی مخالفت (باستثناءِ چند) پوری کی پوری مذہبی پیشوائیت کی طرف

سے ہوئی تھی، لیکن اس میں سرِفہرست مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا نام تھا۔ ان کی طرف سے مخالفت تقسیمِ ہند کے فیصلے تک بہ تکرار و اصرار، منظم طریق پر ہوتی رہی۔ وہ اس تحریک کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے، اور یہ کہہ کر مسلمانوں کو اس کے خلاف ورغلایا کرتے تھے:۔

> مسلم لیگ کے کسی ریزولیشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے ..... جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اسطرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائیگی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہو گی، بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔
>
> (سیاسی کشمکش حصہ سوم ۳۲ — ۱۳۱)

سنہ ۱۹۴۷ء کے وسط تک اس امر کا اصولی طور پر فیصلہ ہو گیا تھا کہ ہندوستان کو اسطرح تقسیم کر دیا جائے گا کہ مسلمانوں کو ان کی اکثریت کے علاقوں میں اپنی آزاد مملکت قائم کرنے کے لئے خطۂ زمین مل جائے۔ اس پر مودودی صاحب (مرحوم) نے اپنی مخالفت کا پینترا بدلا اور مسلم اکثریت کے صوبوں کا رُخ کیا تاکہ وہاں کے مسلمانوں سے کہا جائے کہ وہ اس تحریک کی مخالفت کریں۔ اپریل ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے" خود انہی کی جماعت کے ایک رکن نے ان سے کہا کہ جب مسلمان اپنی جداگانہ مملکت کا مطالبہ کرتے ہیں تو ہم ان کا ساتھ کیوں نہ دیں؟ اس کے جواب میں مودودی صاحب (مرحوم) نے کہا:۔

> جب آپ ایک تحریک کو خود غیر اسلامی مان رہے ہیں تو پھر کس منہ سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کا ساتھ دیا جائے؟
>
> (روئیداد جماعتِ اسلامی حصہ پنجم صفحہ ۶۵)

اس کے باوجود پاکستان وجود میں آ گیا، اور مودودی صاحب (مرحوم) "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" میں پناہ لینے کے لئے ادھر تشریف لے آئے۔ ان کے عزائم ہمیشہ سیاسی رہے تھے۔ لیکن وہ انہیں حاصل مذہب کے نقاب میں کرنا چاہتے تھے۔ یہاں آنے پر ان کے راستے میں ایک مشکل حائل ہو گئی۔ وہ آخر دم تک یہ کہتے رہے تھے کہ اس خطۂ زمین کا مقصد قطعاً یہ نہیں کہ یہاں اسلامی حکومت قائم کی جائیگی۔ اب وہ کس منہ سے کہیں کہ اس خطۂ زمین کو اس مقصد کے لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی حکومت قائم

ہو جائے گی اور اس حکومت کو ہم قائم کریں گے۔ لیکن اس قسم کے موانعات ان لوگوں کے راستے میں حائل ہوتے ہیں جنہیں اصولوں کا کچھ پاس ہو اور راستبازی جن کے نزدیک زندگی کا ناقابلِ تغییر مسلک ہو۔ مودودی صاحب (مرحوم) کا مسلک یہ تھا کہ کسی تحریک کی دعوت کے آغاز میں بڑے بڑے جاذب اور دلکش اصول پیش کرنے چاہئیں۔ لیکن جب حصولِ اقتدار کا وقت آئے تو ان میں تبدیلی کر لینی چاہیئے۔

(ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۵۶ء صـ ۲۳)

ان کا عقیدہ یہ تھا کہ:-

> عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے۔ بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن ۔ مئی ۱۹۵۵ء صـ ۵۶)

لہٰذا ان کے لیئے یہاں آکر بدل جانا کون سا مشکل تھا۔ وہاں انھوں نے کہا تھا کہ "مسلم لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا تھا کہ ان کا مطمحِ نظر پاکستان میں اسلامی نظامِ حکومت قائم کرنا ہے۔" یہاں آکر انھوں نے فرمایا:-

> میں آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں جو کچھ آپ کو سمجھایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پاکستان سے مقصود ایک ایسی حکومت قائم کرنا ہے جس کا نظام خدا کی پاک کتاب اور اس کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی سنت پر مبنی ہو اور تمام مسلمان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ لیڈروں کے ذہن میں اس وقت کچھ بھی ہو، کم از کم زبانوں سے انھوں نے ہر سٹیج اور ہر ممبر پہ کھڑے ہوکر یہی کہا تھا اور عام مسلمانوں نے ان کے انہی وعدوں اور ان کے ظاہر کردہ انہی ارادوں پہ یقین کر کے پاکستان کی تحریک میں ان کا ساتھ دیا تھا۔

(دستوری سفارشات پر تنقید۔ از مودودی صاحب مرحوم صـ ۲)

اس سے بھی ایک قدم اور آگے بڑھ کر انھوں نے فرمایا تھا:-

> پاکستان کی وجہِ جواز میں ہمارا یہ مطالبہ تھا کہ ہمیں ایک ایسا خطۂ زمین ملنا چاہیئے جس میں ہم اپنی تہذیب و تمدن کو از سرِ نو قائم کر سکیں اور اپنے دین کے اصولوں پر اپنی زندگی کو نشوونما دے سکیں۔ (ایشیا ۔ یکم ستمبر ۱۹۶۹ء)

اس سے بھی زیادہ برملا الفاظ میں:-

> ہم نے ایک آزاد مملکت کا قیام چاہا تھا تو اس غرض سے نہیں کہ روئے زمین پر ایک اور ترکی یا ایک اور مصر یا ایران کا اضافہ ہو جائے۔ بلکہ صرف اس غرض سے کہ ایک خالص اسلامی ریاست قائم ہو جو اسلامی نظام کا ایک مکمل نمونہ دنیا کے سامنے

پیش کرے۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر ۱۹۵۰ء)

اس قسم کے اعلانات میں "ہمارا مطالبہ" یا "ہم نے اس ریاست کا قیام چاہا تھا۔" کے الفاظ بڑی گہری سازش کے غماز تھے۔ اس صغریٰ کبریٰ سے جو منطقی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ واضح ہے۔ یعنی

۱۔ ہم نے ایک اسلامی مملکت قائم کرنے کی جدوجہد کی تھی۔

۲۔ ہم نے وعدہ کیا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظام قائم ہوگا۔

۳۔ اب تم اس مملکت کو ہمارے حوالے کرو۔ تاکہ اس میں اسلامی نظام قائم کیا جا سکے۔ اسطرح انھوں نے پاکستان میں "حصولِ اقتدار" کی طرف لے جانے والے راستے پر قدم اوّل رکھ دیا۔ قوم سادہ لوح تھی اور لیڈر اپنے اپنے مفادات کے حصول کی فکر میں غلطاں۔ اس لیے کسی کو یہ سوچنے کی فکر (یا فرصت) ہی نہیں تھی کہ اس قسم کی مہرہ بازیوں کے نتائج کس قدر دوررس ہونگے اس وقت کیفیت یہ تھی کہ:

؎ یاں لعلِ فسوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ اُدھر زلف اڑا لے گئی دل کو

جماعتِ اسلامی یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق کر رہی تھی۔ اس کا اگلا قدم یہ تھا کہ پاکستان کی پارلیمان سے ایک "قرار دادِ مقاصد" منظور کرائی جاتے جس میں پاکستان کو ایک مذہبی ریاست بنانے کا فیصلہ اور عزم ہو۔ اس کے لیے انھوں نے کیا کیا اس کی تفصیل طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۸۳ء (صفحہ ۵۴) میں گزر چکی ہے۔ یہ قرار داد مارچ ۱۹۴۹ء میں پاس ہوئی تھی، اور (مودودی) مرحوم کے ماہنامہ ترجمان القرآن کی اشاعت بابت جون ۱۹۴۹ء میں کہا گیا تھا:

> دستور ساز اسمبلی نے جو قرار داد پاس کی ہے، اس سے آئینی طور پر اس ریاست کی حیثیت اسلامی قرار پا گئی ہے۔

اسطرح "ریاست کے مسلمان" ہو جانے کے بعد قیادت کی راہ ہموار ہو گئی۔ چنانچہ اس مجلہ میں کہا گیا تھا

> یہ مطالبہ جس دن میدان میں آیا تھا، اسی دن ایوانِ اقتدار میں "خطرہ" سونگھ لیا گیا تھا۔ کہ مطالبہ میں "تبدیلیٔ قیادت کا مطالبہ فطرتاً مضمر ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اسلامی نظام اپنے قیام و نفاذ کے لیے اسلامی ذہنیت اور اسلامی سیرت رکھنے والے کارکنوں کا محتاج ہے۔ اس وجہ سے نظامِ اسلامی کے قیام کی تحریک از خود انقلابِ قیادت کی تحریک تھی (ایضاً ص۵۸)

مذہبی قوانین نہیں انتقالِ اقتدار

اس تمہیدی تعارف سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ پاکستان میں "اسلامائزیشن" کی ابتداء تدوینِ قانون کے سوال سے نہیں ہوئی تھی، بلکہ تبدیلیٔ قیادت (انتقالِ اقتدار) کی خواہش سے ہوئی تھی۔ اس تینتیس پینتیس سال کے عرصہ میں جس قدر گرد تدوینِ قوانین کے نام سے اڑائی گئی ہے، اس کا جذبۂ محرکہ درحقیقت حصولِ اقتدار رہا ہے۔ "پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، اس لئے یہاں اسلامی قوانین نافذ ہوں گے اور اسلامی قوانین کا مدوّن کرنا مغرب زدہ مسٹروں کے بس کی بات نہیں

اسے وہی مدوّن کر سکتے ہیں جو علومِ اسلامی کے ماہر ہوں۔" اس فارمولا کی رُو سے مسٹر صاحبان اقتدار کے دائرے سے باہر نکل گئے۔ اور مسئلہ مولوی صاحبان کے طے کرنے کا رہ گیا۔ یہ حضرات جانتے تھے کہ جس فرقہ کے مسلک کے مطابق قوانین مرتب ہوں گے، اقتدار بالواسطہ اس کے ہاتھ میں آ جائے گا۔

اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ مسلمانوں میں اس قدر فرقے ہیں جن کے عقائد، مسالک (حتّٰی کہ شخصی قوانین) ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اور یہ اختلافات اس قدر شدید ہیں کہ ان کی بنیاد پر ان میں باہمی سرپھٹول ہوتی رہتی ہے۔ ان کی موجودگی میں ایسا ضابطہ قوانین کیسے مرتب ہو سکے گا جسے یہ سب متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کریں؟

اکتیس علماء کی کانفرنس

اس اعتراض سے نمٹنے کے لیے ایک ترکیب سوچی گئی۔ ۱۹۵۱ء میں مختلف فرقوں پر مشتمل اکتیس ۳۱ علماء کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی جس میں متفقہ طور پر یہ پاس ہوا کہ:

(۱) پرسنل لاز (شخصی قوانین) ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں گے اور

(۲) پبلک لاز "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب کئے جائیں گے۔

"ایک تیر سے دو نشانے" عام محاورہ ہے۔ لیکن یہ وہ تیر تھا جس سے کئی شکار مارے گئے۔ مثلاً

(i) حکومت کو اس کے اعتراض کا جواب مل گیا۔

(ii) ان میں کچھ ایسے سادہ لوح بزرگ تھے جو مخلصانہ طور پر سمجھتے تھے کہ اس فارمولا کی رُو سے صحیح اسلامی قوانین مرتب ہوں گے اور مطمئن تھے کہ وہ قوانین اس سنت کے مطابق ہوں گے جسے وہ صحیح تسلیم کرتے ہیں۔

(iii) جنہوں نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی تھی (اور ان میں ان کی اکثریت تھی) وہ خوش تھے کہ اس فارمولا کی رُو سے قیامت تک متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکے گا۔ اور انہیں یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ "کیوں؟ ہم نہ کہتے تھے کہ یہ مملکت کامیاب نہیں ہو سکیگی؟" (جیسا کہ آگے چل کر سامنے آ جائے گا، مودودی صاحب (مرحوم) ان میں سرفہرست تھے)

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، اسلامی قوانین مرتب کرنے کے مسئلہ کو کوئی بھی سنجیدگی کے ساتھ (SERIOUSLY) نہیں لے رہا تھا۔ اگر کوئی ایسا کرتا تو مذکورہ بالا فارمولا پر سطحی طور پر غور کرنے سے ہی اس کی حقیقت بے نقاب ہو جاتی۔ یعنی یہ کہ،

(ا) پرسنل لاز اور پبلک لاز کی تفریق غیر اسلامی (یعنی قرآن کے خلاف) ہے۔ ہر فرقہ کے پرسنل لاز اپنے ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ مملکت فرقوں کے وجود پر مہرِ تصدیق ثبت کر دے گی۔ حالانکہ اسلامی مملکت میں فرقوں کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔

(ب) "کتاب و سنت" میں کتاب (قرآن مجید) ایک ایسا صحیفہ ہے جسے تمام فرقے متفقہ طور پر

خدا کی کتاب مانتے ہیں۔ لیکن کرۂ ارض پر کوئی کتاب ایسی نہیں جسے تمام فرقے متفقہ طور پر "سنت رسول اللہ" تسلیم کرتے ہوں۔ ہر فرقے کی سنت الگ الگ ہے۔ جس "سنت" کی رُو سے پرسنل لاز الگ الگ ہیں۔ اس سنت کی رُو سے پبلک لاز کس طرح متفق علیہ مرتب ہو سکیں گے؟

سنت کہتے کسے ہیں

(ج) سنت کی کتاب تو ایک طرف، سنت کہتے کسے ہیں، یہ بھی متفق علیہ نہیں۔ ۱۹۵۱ء کے فارمولا پر دستخط کرنے والوں میں، مودودی صاحب (مرحوم) اور جماعت اہل حدیث کے صدر، مولانا محمد اسمٰعیل (مرحوم) پیش پیش تھے اور ان دونوں میں یہ بحث چل رہی تھی کہ سنت کہتے کسے ہیں؟ اس بحث کی تفصیل، مولانا (مرحوم) کی طرف سے شائع کردہ کتاب "جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث" اور مودودی صاحب (مرحوم) کی کتاب رسائل و مسائل حصہ اوّل میں ملے گی۔ ما حصل اس بحث کا یہ تھا کہ جن امور کو مولانا (مرحوم) سنت قرار دیتے تھے ان کے متعلق مودودی صاحب کا ارشاد تھا کہ۔

> اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے۔
>
> (رسائل و مسائل حصہ اوّل ص۳۰۵)

اور جن امور کو مودودی (مرحوم) سنت قرار دیتے تھے ان کے متعلق مولانا اسمٰعیل (مرحوم) کا ارشاد تھا کہ۔

> ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعت اسلامی کا نظریۂ حدیث ص۶۳)

سنت کے کسی متفقہ علیہ مجموعہ کی موجودگی تو ایک طرف، سنت کی تعریف (DEFINITION) کے متعلق ان کے باہمی اختلاف کا یہ عالم تھا اور اس کے باوجود ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اسلامی قوانین کتاب و سنت کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں!

لیکن اربابِ اقتدار تھے یا اعیانِ مذہب۔ اصحابِ فکر و دانش تھے یا ماہرینِ قانون۔ ملک میں کسی نے بھی اس فارمولا کا جائزہ نہ لیا۔ حتیٰ کہ اسے آئینِ پاکستان میں بھی شامل کر لیا۔ اس کا تجزیہ کیا تو طلوعِ اسلام نے۔ اس کے اعتراضات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کے لئے انہوں نے اپنا دیرینہ آزمایا ہوا حربہ استعمال کیا۔ یعنی اسے "منکرِ حدیث" قرار دے کر اس کے خلاف کفر کے فتاویٰ صادر کر دیئے اور یوں (شترمرغ کی طرح ریت میں سر دے کر) سمجھ لیا کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

لیکن اس کی تہ میں جو مقصد تھا وہ ضرور حاصل ہو گیا یعنی ہر حکومت کے خلاف یہ پراپیگنڈہ جاری رکھا گیا۔ کہ وہ اسلامی قوانین مرتب نہیں کرتی۔ کوئی قریب بیس سال تک یہ پراپیگنڈہ جاری رہا

تاآنکہ خود مودودی صاحب (مرحوم) کو ۱۹۷۰ء میں یہ اعلان کرنا پڑا کہ۔

> کتاب وسنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاز کے معاملوں میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو (ایشیا ۲۳ اگست ۱۹۷۰ء)

اس اعلان کی تہ میں کیا مصلحت پوشیدہ تھی، اس کا ذکر تو بعد میں کیا جائے گا۔ اس مقام پر اتنا دیکھ لینا کافی ہوگا کہ سارے ملک میں سے کسی ایک شخص نے بھی مودودی صاحب (مرحوم) سے یہ نہ پوچھا کہ جب آپ جانتے تھے کہ کتاب وسنت کی رُو سے کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا تو آپ نے ۱۹۵۱ء میں اسے منظور کیوں کیا تھا اور بیس برس تک اس پہ زور کیوں دیتے چلے آ رہے تھے؟ کسی ایک نے بھی اتنا نہ پوچھا، حتیٰ کہ جنہوں نے اسے دستورِ پاکستان میں شامل کیا تھا، انھوں نے بھی یہ نہ پوچھا۔ اس سے آپ اندازہ لگائیے کہ یہ حضرات تدوینِ قوانین کے معاملہ میں کس حد تک سنجیدہ (SERIOUS) تھے؟

اب آئیے اس مصلحت کی طرف جس کے پیشِ نظر مودودی صاحب (مرحوم) نے یہ مشورہ دیا تھا۔

حنفی فقہ اور مودودی صاحب (مرحوم)

ان سے پوچھا گیا کہ پھر ملک میں اسلامی قوانین کے سلسلہ میں کیا کیا جائے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ فقہ حنفی نافذ کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں پہلے تو یہ دیکھئے کہ فقہ حنفی کے متعلق خود مودودی صاحب (مرحوم) کے کیا خیالات تھے۔ یہ فقہ حنفی ائمہ سلف کے مدوّن کردہ قوانین کا نام ہے اور ائمہ سلف کے متعلق ان کا ارشاد تھا کہ:۔

(۱) یہ سلف کون سے انبیاء تھے جن پر ایمان لانے کی مسلمانوں کو تکلیف دی گئی ہے۔

(۲) میرا طریقہ یہ ہے کہ میں ان میں سے کسی کی تحقیق کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا اور جب میرا ان سے اطمینان نہیں ہوتا تو غور وفکر کرکے رائے قائم کرتا ہوں۔ میں نہ مسلکِ اہلِ حدیث کو، اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ صحیح سمجھتا ہوں، اور نہ حنفیت یا شافعیت کا پابند ہوں۔

(۳) میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لیے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔

(۴) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کرکے اجتہاد کرے دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لیے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا۔ کیونکہ انسانی عقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقیّد ہوتا ہے۔

(۵) (اور حرفِ آخر یہ کہ) دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

(ان اقتباسات کے حوالوں کے لیے طلوعِ اسلام بابت جنوری ۱۹۸۳ء ص ۳۲ دیکھیے)

۱۹۵۱ء کا فارمولا اس لیے دیا گیا تھا کہ حکومتوں کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا حربہ ہاتھ آجائے۔ اور پھر حنفی فقہ نافذ کرنے کا مشورہ اس لیے دیا کہ فرقہ وارانہ انتشار کے دروازے کھل جائیں۔

شیعہ حضرات کو تو چھوڑیئے کہ ان کی اپنی احادیث، اپنی سنت، اپنی فقہ ہے۔ انھوں نے زکوٰۃ سے متعلق آرڈیننس کے خلاف جس طرح احتجاج کر کے اپنے آپ کو اس سے مستثنےٰ قرار دلا لیا تھا، وہ کل کی بات ہے۔

اہلحدیث اور فقہ

سُنّیوں میں اہلِ حدیث اور اہلِ فقہ (حنفی) معروف فرقے ہیں۔ ملک میں حنفی فقہ نافذ کرنے کے خلاف (زکوٰۃ وعشر کے آرڈیننس کے ضمن میں) اہلِ حدیث کا ردِعمل یہ تھا:-

> مرکزی جمعیت اہلِ حدیث نے اعلان کیا ہے کہ اگر ان کے مطالبات تسلیم نہ کیے گئے تو تقریباً ایک کروڑ اہلِ حدیث افراد اہلِ تشیع کی طرح بنکوں سے رقوم نکلوانے کے سوال پر غور کریں گے۔ تنظیم کے مرکزی امیر، مولانا معین الدین لکھوی نے آج یہاں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے استفسار کیا کہ آیا صدرِ مملکت اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ عشر و زکوٰۃ کی شرائط نصاب اور مصارف کے سلسلہ میں جس طرح اہلِ تشیع کو اہلِ سنت سے اختلاف ہے، اسی طرح زکوٰۃ وعشر کے بیسیوں مسائل میں اہلِ حدیث کو اہلِ فقہ سے اختلاف ہے۔ صدر نے مرکز و صوبائی زکوٰۃ عشر کونسلوں کا جو اعلان کیا ہے اس میں عدالت ہائے عالیہ کے ججوں کے تحت قانونی و فنی ماہرین کے ساتھ شیعہ، بریلوی اور دیوبندی علماء کو نمائندگی دی گئی ہے۔ لیکن جماعت اہلِ حدیث کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان کونسلوں میں مسلک اہلِ حدیث کی نمائندگی کوئی نہیں کرے گا۔ انہوں نے کہا کہ حنفی علماء، چاہے بریلوی ہوں یا دیوبندی، فقہ حنفی ہی سے راہنمائی حاصل کریں گے اور شیعہ ارکان فقہ جعفریہ سے۔ لیکن اہلِ حدیث نہ فقہ حنفیہ کو واجب العمل سمجھتے ہیں۔ اور نہ فقہ جعفریہ کو۔ ان کے نزدیک صرف قرآن اور حدیث واجب التعمیل ہیں ان حالات میں کونسلوں کے طے کردہ قاعدے اور ضابطے اہلحدیث کے نزدیک نہ تو کسی اہمیت کے حامل ہونگے اور نہ کسی اعتماد کے قابل۔
>
> (روزنامہ مساوات مورخہ ۱۲ جون ۱۹۸۰ء)

یہ تھا ردِعمل اہلِ حدیث کا، فقہ حنفی کے خلاف۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ فقہ حنفی (یا کسی اور فقہ) کی رُو سے جو ضابطۂ قوانین مرتب اور نافذ ہو گا۔ اس کا نتیجہ کیا ہو گا! یہ تو پھر بھی دو فرقوں (اہلِ حدیث اور حنفیوں) کی بات ہے۔ خود حنفی فقہ کی دو شاخوں (دیوبندی اور بریلوی) کی یہ حالت ہے کہ وہ ایک دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے اور "رسول اللہ" اور "یا رسولؐ اللہ" کانفرنسوں کے سلسلہ میں ملک جس خونریزی اور فساد انگیزی کے دہانے تک پہنچ گیا تھا۔ اس کے تصور سے روح کانپ اُٹھتی ہے۔

پبلک لاز کے سلسلہ میں شہادت اور قصاص سے متعلق قوانین کے مسودات بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح برسوں سے ایک ہی مقام پر گردش کر رہے ہیں۔ فقہ کی رُو سے ان میں عورت کی دیت مرد کے مقابلہ میں نصف قرار دی گئی ہے۔ روزنامہ جنگ (لاہور) کی اشاعت بابت ۱۲ مئی ۱۹۸۲ء

کے صفحۂ اوّل پر ڈاکٹر ریاض الحسن نوری کے قلم سے ایک مقالہ شائع ہوا ہے۔ جس کی چار کالمی رنگین جلی سُرخی میں کہا گیا ہے، "حدیث کی کسی بھی کتاب سے عورت کی نصف دیت ثابت نہیں۔

لیکن یہ بھی حرفِ آخر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ (مولانا سید حامد میاں کی تحقیق کی رُو سے) حدیثوں کی تعداد دس لاکھ سے بھی زیادہ ہے اور ایسا عالم دیکھنے میں نہیں آیا جسے ان احادیث کے تضمنات کا پورا پورا علم ہو۔" (طلوع اسلام - جون ۱۹۸۳ء ص ۲۲)

ان تصریحات کی روشنی میں آپ خود فیصلہ فرمائیے کہ کیا پاکستان میں پبلک لاز کے کسی متفق علیہ ضابطہ کے مرتب ہونے کا امکان ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہوگا۔ لیکن مودودی صاحب (مرحوم) نے اس کا جواب اثبات میں دیا تھا۔ انھوں نے ۱۹۶۹ء میں کہا تھا:

اقتدار مجھے دو

> میں واضح طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اسلامی قوانین کا نفاذ اگر ہو سکتا ہے تو صرف اسطرح ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہے ان کو اقتدار سے ہٹایا جائے اور ملک کا اقتدار ان لوگوں کے ہاتھ میں منتقل ہو جو اسلام کو جانتے بھی ہیں۔ دل سے مانتے بھی ہیں۔ اور اس کے احکام کو نافذ کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ موجود بھی ہیں اور جس روز ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا اس کے دوسرے روز اسلامی احکام نافذ ہو جائیں گے (ایشیا - ۹ مئی ۱۹۷۷ء)

اس سے (انگریزی محاورہ کے مطابق) "بلی، تھیلے سے باہر آگئی۔" انھوں نے قرارداد مقاصد منظور کرانے کے سلسلے میں جس مقصد کا اظہار کیا تھا، وہ اب کھل کر سامنے آگیا۔ ۱۹۷۷ء میں "نظامِ مصطفیٰؐ" کے نقاب میں جو تحریک شروع کی گئی تھی، وہ اسی مقصد کے حصول کی پہلی کڑی تھی۔ چنانچہ (کالعدم) جماعت اسلامی کے امیر، میاں طفیل محمد صاحب نے واضح الفاظ میں کہا۔

> (نظام مصطفیٰؐ والا) احتجاج صرف ایک شخص کو اقتدار سے ہٹانے کے لیے تھا۔
>
> (روزنامہ جنگ۔ لاہور۔ مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۷۸ء)

اس شخص (مسٹر بھٹو مرحوم) کو اقتدار سے ہٹایا گیا تو مودودی مرحوم حصولِ اقتدار کے سلسلے میں اس قدر متیقن تھے کہ انھوں نے اسلامی جمعیت طلباء کے سالانہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

> اب حالات اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ آج نہیں تو چند روز بعد اس کام کو فروغ حاصل ہوگا۔ اور ملک کا کام چلانے کا کام بھی آپ کے ذمے لگنے والا ہے۔ (ایشیا، نومبر ۱۹۷۸ء)

لیکن جنرل ضیاء نے یہ کہہ کر انھیں اطمینان دلادیا کہ اللہ تعالیٰ نے اسلامی احکام کے نفاذ کا فریضہ ان کے سپرد کر دیا ہے۔ مودودی (مرحوم) بہت دور کی سوچتے تھے۔ وہ اس بات پر زور دیتے رہے کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کی جائے۔ جب جنرل موصوف نے حدود آرڈیننس کا اجراء کیا ہے (جو فقہ حنفی پر مبنی تھے) تو مودودی مرحوم نے یہ کہہ کر ان کا استقبال کیا کہ وہ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام ہیں۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ وہ احکام خدا اور رسولؐ کے نہیں، فقہا سلف کے مرتب کردہ ہیں

ناممکن العمل بھی ہیں اور مختلف فرقوں کے درمیان مخالفت اور مناقشت پیدا کرنے کا موجب بھی۔ لہٰذا یہ چند دنوں کے بعد خود بخود ناکام بھی ثابت ہو جائیں گے اور ملک میں انتشار بھی پیدا کر دیں گے۔ چنانچہ بعد کے حالات نے اس کی تصدیق کر دی۔ یہ ہے وہ مقام جہاں "تدوینِ قوانین" کے سلسلہ میں ہم اس وقت کھڑے ہیں۔ بےبسی ہائے تمنّا کہ نہ دنیا ہے نہ دین!

اب رہا یہ سوال کہ کیا ان حالات میں اسلامی قوانین مرتب ہو سکتے ہیں؟

اس کے جواب کے لئے کسی سقراط کے دماغ کی ضرورت نہیں۔ حالات بالکل واضح ہیں۔ اس وقت ملک کا طے شدہ فیصلہ یہ ہے کہ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب ہوں گے۔ سنّت کی پوزیشن ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہم ان حضرات سے ایک عرصہ سے یہ کہتے چلے آ رہے ہیں۔ کہ اگر سنّت کو قوانین کا سرچشمہ قرار دیا جانا مقصود ہے تو سنت کا ایک ایسا مجموعہ مدوّن کیجئے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو اور اس میں کوئی بات قرآن کے خلاف نہ ہو۔ ان میں سے کسی نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جواب کیسے دیتے جب انہیں معلوم ہے کہ سنت کا متفق علیہ مجموعہ تو ایک طرف، اس کی تعریف (DEFINITION) تک بھی متفق علیہ نہیں۔ اس حقیقت سے سب واقف ہیں۔ وفاقی شرعی عدالت نے کتاب و سنّت کی رُو سے رجم کو خلاف اسلام قرار دیا اور اس عدالت کے ججوں میں کچھ تبدیلی کر دی گئی تو انہوں نے اسی کتاب و سنت کی رو سے رجم کو مطابق اسلام قرار دے دیا۔

اسیطرح فقہ کے متعلق بھی سب جانتے ہیں کہ یہ نہ خدائی احکام ہیں جو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہتے ہیں، اور نہ ہی اس قابل کہ یہ ہمارے زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ کیونکہ یہ ہزار برس پہلے کے مقننین کے وضع کردہ ہیں جو ظاہر ہے کہ آنے والے زمانے کے تقاضوں کا احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔ سب یہ جانتے ہیں۔ لیکن چونکہ دین کے معاملہ میں سنجیدہ (SERIOUS) نہیں اس لئے کوئی ان کے خلاف آواز اٹھانے کی جُرأت نہیں کرتا کہ کون بھڑوں کے چھتّے کو چھیڑے!

یہ قوانین اگر مفتی صاحبان کے فتووں کی طرح شخصی رہتے تو بھی خیر تھی کہ جس کا جی چاہتا انہیں مانتا، جس کا جی چاہتا نہ مانتا۔ لیکن ان کے قانونِ مملکت قرار پا جانے سے ان کی پوزیشن یکسر بدل گئی۔ فقہ کے جو فیصلے انگریز کی عملداری میں قانونِ مملکت (پرسنل لاز) بن گئے تھے ان سے معاشرہ کو جو نقصان پہنچا ہے اور پہنچ رہا ہے، اس کا ہر ایک کو تجربہ ہے۔

(۱) وصیّت ایک تہائی مال سے زائد میں نہیں کر سکتے اور وہ بھی وارثوں میں سے کسی کے حق میں نہیں

(۲) یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے حصّہ نہیں مل سکتا (غنیمت ہے کہ عائلی قوانین نے اس کی اجازت دے دی ہے۔ اگرچہ مولانا حضرات ان قوانین کے پیچھے لٹھ لیے پھر رہے ہیں)۔

(۳) تقسیم وراثت قرآن کے بجائے فقہ کی رو سے ہوگی۔

(۴) تین طلاق کہہ دینے سے ایسی طلاق لاحق ہو جائے گی جس سے رجوع کرنے کے لیے حلالہ کی ضرورت لاحق ہو۔

(۵) شفعہ کا قانون :۔

یہ اور اس قسم کے دیگر قوانین، جن کی مجبوراً اطاعت کرنی پڑتی ہے۔ اور اب ان پر مزید اضافہ۔ حدود سے متعلق قوانین، زکوٰۃ و عشر کے متعلق قوانین۔ زیر تدوین قصاص دیت اور شہادت وغیرہ سے متعلق قوانین۔

آپ سوچئے کہ ایک شخص جانتا ہے کہ یہ قوانین خلاف قرآن ہیں، لیکن پھر بھی ان کی اطاعت کے لئے مجبور رہے!

* * *

اب رہا یہ کہ اسلامی قوانین مرتب کس طرح سے ہوں گے، سو اس سلسلہ میں سب سے پہلے اور بنیادی طور پر یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اسلامی قوانین اسلامی مملکت میں مرتب اور نافذ ہونے ہیں۔ اس کے لئے واضح طریق یہ ہے کہ :

(۱) جن قوانین و احکام کا قرآن مجید میں بالتصریح ذکر ہے انہیں قوانین مملکت کی حیثیت سے نافذ کیا جائے گا۔ اور ان کے نفاذ کے طریق امت کی مشاورت سے طے پائیں گے۔

(۲) جن احکام کو قرآن نے اصولی طور پر دیا ہے۔ ان کی عملی جزئیات امت کے مشورہ سے متعین اور اسلامی مملکت کی طرف سے نافذ ہونگی۔

(۳) جن امور میں قرآن خاموش ہے ان کے متعلق احکام، قرآن کی حدود کے اندر رہتے ہوئے امت کے مشورہ سے مدون اور حکومت کی طرف سے نافذ ہوں گے۔

(۴) امت کے یہ مشورے اجتہاد کہلائیں گے۔ جو کچھ اس اجتہاد کی رو سے طے پائیگا، وہ قابل تغیر و تبدل ہوگا۔

(۵) ان قوانین میں پرسنل اور پبلک لاز میں کوئی تفریق نہیں ہوگی اور اسلامی مملکت میں رہنے والے تمام مسلمانوں پر ان کا یکساں اطلاق ہوگا۔

* * *

یہ بھی واضح رہے کہ کوئی مملکت محض چند قوانین نافذ کرنے سے اسلامی نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے سب سے پہلے معاشرہ کو اسلامی بنانا ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کی امتیازی خصوصیات متعدد ہیں، لیکن ان میں سرفہرست دو ایک ایسی ہیں جن سے وہ معاشرہ منفرد اور متمیز حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً :۔

(۱) اس معاشرہ میں کوئی فرد ضروریات زندگی سے محروم نہیں رہتا۔

(۲) اس میں تمام انسانوں کو محض انسان ہونے کی حیثیت سے یکساں واجب التکریم سمجھا جاتا، اور احترام و شرف آدمیت کو اصل تہذیب قرار دیا جاتا ہے۔

(۳) اس میں نہ کوئی کسی کا محکوم ہوتا ہے۔ محکومیت صرف کتاب اللہ کی ہوتی ہے۔

محترم پرویز صاحب کا ہفتہ وار درس قرآن کریم

محترم پرویز صاحب کے اس درس نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی ہے۔ مرکزی درسگاہ تو ادارہ طلوعِ اسلام (۲۵/B، گلبرگ ۲) ہے جہاں یہ درس (آجکل) ہر جمعہ کی صبح ۸ بجے شروع ہوتا ہے لیکن اندرون پاکستان اور بیرونی ممالک میں اسے ٹیپس (TAPES) کے ذریعے عام کیا جاتا ہے۔ حسب ذیل مقامات پر یہ (V-C-R) کے ذریعے نشر ہوتا ہے۔

کراچی:- ہر جمعہ ۹½ بجے صبح دارالزہرہ بالائی منزل بالمقابل شاپ نمبر ۲ سرمد روڈ (کراچی صدر)	**گجرات**:- ہر جمعرات تین بجے سہ پہر رہائش گاہ ڈاکٹر محمد اکرم مرزا صاحب جناح کالونی (گجرات) ٹیلیفون نمبر ۳۹۳۰ + ۳۲۹۰
اوسلو:- (ناروے) ہر اتوار شام ۵ بجے بمقام:- JINNAH HALL, KEYSERS GATE-I OSLO-I زیر انتظام زاہد صفدر صاحب ٹیلیفون نمبر 306988—674040	**فریڈرکستاد**:- (ناروے) ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا اتوار شام ۴ بجے بمقام ARNE SVENDSENS-GATE-4, 1600 FREDRIKSTAD, NORWAY TEL: (032) 10287/22802
لندن:- (یوکے) ہر ماہ کے آخری اتوار ۲ بجے بعد دوپہر بمقام 47 HURLEY ROAD GREEN FORD MIDDLE SEX TEL: 01—578—5631	**برمنگھم** (انگلینڈ) ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے بعد دوپہر 227/229 ALUM ROCK ROAD 38 - 3BH (BIRINGHAM)
ٹورنٹو (کینیڈا):- ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح 335 DRIFTWOOD AVE: #311, DOWNS VIEW, TORNTO (ONT.) M3N—2P3, TEL: (416) 661—2827	**ملتان**:- ہر جمعہ ۹ بجے صبح دفتر میسرز شاہ سنز بیرون پاک گیٹ - فون نمبر (۳۱۰۷۱)

لندن یوکے	ہر ماہ کے دوسرے اتوار	39 MANSELL RD GREENFORD MIDDX TEL: 01—575—5862

اور ذیل کے مقامات پر عام (TAPES) کے ذریعے

نام بزم طلوع اسلام	دن اور وقت	مقام اور درس کے کوائف
لاہور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	۲۵-بی گلبرگ ۲ نزد پولیس سٹیشن فون نمبر:- ۸۸۰۸۰۰
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲½ بجے بعد دوپہر	76, PARK ROAD, ILFORD, TELPHONE No. 553— 1896
پشاور چھاؤنی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ ۵ آغا محمد یونس صاحب، رفیق لین صدر (بالمقابل VIP MAINGATE PESHAWAR STADIUM باڑہ روڈ فون:- ۴۲۹۵۹
پشاور	جمعہ ۹ بجے صبح	شیریں محل B-3 یونیورسٹی ٹاؤن

نام بزمِ طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس کے کوائف
مردان	جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف، محمود علی صاحب۔ اکاخیل بلڈنگ نواب علی روڈ۔
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	بی۔ ۱۶۲ لیاقت روڈ
لیہ	جمعہ بعد نمازِ جمعہ	شبیر مکینیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ لیہ
سرگودھا	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک واٹر سپلائی، مکان نمبر ۴۔ نظامی منزل
فیصل آباد	جمعہ ۳½ بجے سہ پہر	حیات سرجری کلینک، c/۲۳ پیپلز کالونی نمبر ۱ فون نمبر:- ۴۲۸۵۵)
ہنگو	جمعہ ۵½ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ فون نمبر (۶۷)
پنجکسی تحصیل کبیر والا (ملتان)	جمعہ ۳ بجے سہ پہر	مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)
بہاولپور	جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ، رمنی پورہ، باہتمام (ڈاکٹر ہومیو) محمد اعظم خاں صاحب۔ (بائی پاس روڈ بہاولپور)
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے: ریڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر، توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب
گوجرانوالہ	جمعہ بعد نمازِ جمعہ	دفتر بزم، ملحق رہائش گاہ: چوہدری مقبول شوکت صاحب گل روڈ (سول لائنز)
گجرات	جمعہ بعد نمازِ جمعہ اور اتوار ۴ بجے سہ پہر	۱۲۰/ا۔ بی۔ جمبھر روڈ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ
جلال پور جٹاں	جمعہ بعد نمازِ جمعہ	دفتر بزمِ طلوعِ اسلام (بازار کلاں)
ایبٹ آباد	(۱) جمعہ ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ: صلاح الدین صاحب۔ واقع 234-K-L کہیال (ایبٹ آباد)
〃	(۲) اتوار ۴ بجے سہ پہر	رہائش گاہ غلام مصطفےٰ اعوان صاحب K-355 گنج گراؤنڈ (ایبٹ آباد)
بوریوالہ	ہر ماہ کا پہلا اور تیسرا جمعہ بعد نمازِ جمعہ	برمکان محمد اسلم صابر۔ مرضی پورہ گلی نمبر ۵ تیسرا چوک ملتان روڈ بورے والہ

سکوت و سکون کیساتھ استفادہ کے خواہشمند حضرات کیلئے شرکت کی دعوت ہے۔